انشائیے
خیال پارے
آغا

قیوم نظر

"زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ، یا اس کا فلسفہ، نئی اور پرانی اقدار کا تقابل، اقتصادی مسائل سے آگہی، تہذیبی سلسلوں کا شعور، معتدل اندازِ بیان، تشبیہات اور استعارات کا استعمال، ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی۔ یہ سب مِل ملا کر پڑھنے والے کو خوش مزگی کے عالم میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے پر اکساتی ہیں، ان انشائیوں میں ادعا پرستی ہے، نہ دلائل و براہین سے سروکار، یہ مضامین دِن بھر کے تھکا دینے والے کام کاج کے بعد ذہن میں آسودگی کی لہر دوڑا دینے کے ضامن بننے کی اہلیت رکھتے ہیں، یہ ہمارے بعض موجودہ مسائل کی ایسی یک رُخی تصویریں ہیں جن کا دوسرا رُخ پڑھنے والا خود مہیا کرنے میں مسرت حاصل کرتا ہے۔"

ڈاکٹر ابنِ فرید

"وزیر آغا کے انشائیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ بہت RELAXED انداز میں موضوع کو چھیڑتے ہیں اور لمحۂ فکریہ تک پہنچا دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

"انشائیہ نگاری کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے "خیال پارے" میں برتنے کی کوشش کی ہے اور موضوعات اور طرزِ نگارش دونوں اعتبار سے ان کے یہاں انشائیہ کی رُوح ملتی ہے۔ وزیر آغا کے اِن مضامین کو جُوں جُوں پڑھتے جائیے اُن جانی بُوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں یہ احساس ہوگا کہ ہم انہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انہیں اس زاویے سے کیوں نہ دیکھا۔ تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر اِن مضامین کا نمایاں وصف ہے۔

"خیال پارے" ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ انشائیہ نگاری کے باب میں ان کی خدمات کا منکر شاید ہی کوئی ہو۔"

قیمت : ۲۵ روپے

خیال پارے

(انشائیے)

وزیر آغا

مکتبہ اُردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا

ضابطہ

حقوق :........ بحقِ مصنف محفوظ

طبع اوّل :........ ۱۹۶۱ء

طبع دوم :........ ۱۹۸۴ء

ناشر :........ نُصرت انوار

مطبع :...... فنون پریس رائل پارک لاہور

سرورق :........ موجد

خطاطی :........ صغیر شیروانی

قیمت : پچیس روپے

مکتبہ اُردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا

نسیم شمائل پوری کے نام

فہرست

۱- تقدیم	۷
۲- انشائیہ کیا ہے؟	۹
۳- پگڈنڈی	۲۱
۴- بہادری	۲۵
۵- خاموشی	۲۹
۶- چھکڑا	۳۳
۷- آندھی	۳۹
۸- ریلوے ٹائم ٹیبل	۴۳
۹- بے ترتیبی	۴۹
۱۰- کچھ علالت کی حمایت میں	۵۵
۱۱- قطب مینار	۶۱
۱۲- ڈبویا مجھ کو ہونے نے	۶۷
۱۳- گرمی	۷۳

۱۴- ٹریول لائٹ	۸۱
۱۵- آگ تاپنا	۸۷
۱۶- کچھ خوبصورتی کے بارے میں	۹۷
۱۷- سُست روی	۱۰۳
۱۸- موٹر	۱۰۹
۱۹- ریل کا سفر	۱۱۵
۲۰- تنہائی	۱۲۱
۲۱- دُھند	۱۲۷
۲۲- وہ	۱۳۳
۲۳- آسیب	۱۳۷
۲۴- لحاف	۱۴۳
۲۵- اجنبی دیار میں	۱۴۷

تقدیم

رفیقِ گرامی ڈاکٹر وزیر آغا چند دنوں سے ہمارے بعض بلند پایہ رسائل میں کچھ ایسے مضامین لکھ رہے تھے، جنھیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اُس بچّے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو اور جس نے "گھر کا کام" بھی نہ کیا ہو، لیکن اُس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کی بجائے اُن میں برفی اور قلاقند کے دو بڑے بڑے لفافے تھما دیئے جائیں۔ میں کچھ عرصے تک اُن کی اس شعبدہ بازی کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اِس یافتِ لطیف کو عام کیونکر کیا جائے۔ آخر ایک دن جب میں ان کا ایک پارۂ انشا ——— (غالباً "لحاف") پڑھ کر اُسی بچّے کی سی کیفیت میں مبتلا تھا، جس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں، یہ تجویز یک بیک میرے ذہن میں آئی کہ آغا صاحب کے ان بکھرے ہوئے پاروں کو جمع کر کے ادبِ اُردو کی ایک جدید ترین صنف کے اظہارِ اوّلیں کے طور پر اہلِ ذوق کی خدمت میں برملا پیش کر دیا جائے اور پھر ہر چہ باد ا باد ———!

آغا صاحب نے میری اس تجویز کو نہ صرف شرفِ قبول بخشا، بلکہ مجوّزہ مجموعے کے

لئے ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ بھی لکھ ڈالا۔ جس میں وہ تمام رُموز و نکات نہایت وضاحت سے بیان فرما دئے، جو اُن کے اِس فنّی تجربے سے نسبت رکھتے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اُن کے اِس نہایت دلآویز مقدمے کے مطالعے کے بعد زیرِ نظر مجموعے کے پارے دوگونہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور ان کے مصنّف نے ادب کی اس نئی پگڈنڈی پر جو چراغ روشن کیا ہے، اس کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں ہمارے نئے لکھنے والے اور آگے بڑھیں گے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے اپنے چراغ اسی طرح رکھتے چلے جائیں گے۔ ادب کی نئی منزلیں یوں ہی دریافت ہوتی ہیں۔ اور راتوں کو چلنے والے مسافر اسی طرح اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچتے ہیں۔ سلام ہے اُن پر جو کسی بامراد سفر کا آغاز کرتے ہیں اور مُبارک ہیں وہ لوگ جو مسلسل نئی منزلوں کی جستجو میں اپنے ذوقِ طلب کو کبھی پژمردہ و فسردہ نہیں ہونے دیتے۔

صلاح الدین احمد

انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ کیا ہے؟ ——— بادی النظر میں انشائیہ یا پرسنل ایسّے کی حدود کو متعین کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے۔ کیونکہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے انشائیہ کے مفہوم اور ہیئت میں کئی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں بلکہ ہر انشائیہ کیا بہ لحاظ مواد اور کیا بہ لحاظ تیکنیک ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے بیکن، لیمب اور ہیزلٹن کے طریقِ کار میں اتنی تفاوت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح دورِ جدید کے بیشتر لکھنے والوں نے انشائیہ کے سلسلے میں کافی سے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے اور ناقد کے لیے انشائیہ کے مقتضیات اور امتیازی محاسن کو علیحدہ کر کے رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم غائر نظر سے دیکھنے پر انشائیہ کی متنوع کیفیات اور ابلاغ و اظہار کے مختلف سانچوں کے پسِ پشت ایک علیحدہ صنفِ ادب کے نقوش واضح طور پر اُبھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہم ذرا کوشش سے انشائیہ کی حدود کو متعین اور محاسن کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصنافِ ادب سے ممیز کرتی ہے۔ اِس کا غیر رسمی طریقِ کار ہے۔ در اصل انشائیہ کے خالق کے پیشِ نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردّ و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیئے زندگی کی سنجیدگی اور گھما گھمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریقِ کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردِّ عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید یا تفسیر کا خالق اس افسر کی طرح ہے جو چُست اور تنگ سا لباس زیبِ تن کیئے دفتری قواعد و ضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا، احتساب اور تجزیے کے تمام مراحل سے گزرتا ہے اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اُتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے۔ اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حُقّہ کی نَے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرّت سے اپنے احباب سے مصروفِ گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔ اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریقِ کار کی بجائے ایک غیر رسمی طریقِ کار اختیار کرتا ہے۔ بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کی بجائے اپنی رُوح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردِّ عمل کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پاس کہنی ایک ایسی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے ——— اس طور کہ آپ فی الفور اس کے دائرۂ احباب میں شامل ہو جاتے اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔ شاید اُسے کوئی واقعہ بیان کرنا ہوتا ہے یا کسی "ذہنی کیفیت" پر سے نقاب اٹھانا یا محض زندگی کے مظاہر کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنا ہوتا ہے اور وہ اس صنفِ ادب کا سہارا لے کر اپنی شخصیت یا ذات کے کسی نہ کسی گوشے کو عریاں کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ بنیادی

طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔ کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ محض ایک "سہارے" کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا۔ کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی ——— اس کے برعکس ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران میں آپ شاید حظ، مزاح، طنز، تعجب، اکتساب علم اور تخیل کی سُبک روی، ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی تاریک گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اُٹھ آئے ہیں۔ کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاعِ گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے، بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کر دیتا ہے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی "عدم تکمیل" ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع زیرِ بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطۂ نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل و اکمل صورت اختیار کر لے وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں، جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (LOOSE) ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں

کیا جاتا اور انشائیہ کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ لکھنے والے نے موضوع کے صرف اُن پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جو اس کے شخصی ردِّ عمل سے اثر پذیر تھے اور جن کی نوکیلی کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مُصنّف اُن کو ناظر تک پہنچانے کی سعی کرتا۔ اِس مقام پر ایک انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے ۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اُجاگر تو کیا جاتا ہے۔ لیکن اِس کے تمام تر پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لئے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال ایک انشائیہ کا ہے کہ اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے والے کا مقصد آپ کی سوچ بچار کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے بے شک وہ اپنے موضوع کے بیان میں صرف شخصی واردات اور تجربات اور اپنے ذاتی ردِّ عمل کے اظہار تک ہی اپنی مساعی کو محدود رکھتا ہے۔ تاہم اس کے پیشِ نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعہ کے بعد کتاب کو چند لخطوں کے لئے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

انشائیہ کی اس روش کا نتیجہ انشائیہ کی وہ مخصوص صورت ہے جو اسے دوسری اصنافِ ادب سے ممیّز کرتی ہے۔ یعنی ایک انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رُخ دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ جذبات احساسات اور تخیّلات میں کانٹ چھانٹ اور کفایت ECONOMY کا قائل نہ ہو، اس کے لیے چند لفظوں میں موضوع کی سب

سے نوکیلی کیفیات کو پیش کرنا مشکل ہوگا، لیکن اختصار کی یہ خصوصیت اس بات کی تابع ہے کہ انشائیہ کا پسِ منظر کس قدر شاداب یا بے آب وگیاہ ہے۔ چنانچہ بقول ہڈسن اگر انشائیہ لکھنے والے نے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کی باتیں ہی گنتی میں کم ہیں اور اس کے تجربات اور محسوسات تعداد اور شدت میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تو اس کا لکھا ہوا انشائیہ یقیناً انشائیہ کے معیار پر پُورا نہیں اترے گا۔ اس کے برعکس اگر انشائیہ لکھنے والے کا ذہن زرخیز ہے اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن اس نے انشائیہ کی محدود سی دنیا میں اپنے احساسات اور تخیلات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے تو اس کا یہ انشائیہ یقیناً ایک قابلِ قدر چیز ہوگا اور ناظرین کو وہ تمام کیفیات مہیّا کرے گا جو انشائیہ سے مخصوص ہیں۔

ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہئے۔ اس کی "تازگی" ہے۔ یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی صنفِ ادب فن کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی۔ تاہم شاید انشائیہ ہی ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے، بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز تو بہر حال انشائیہ میں موجود ہونی چاہئے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اِن کے بہت سے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے اور زندگی ہمارے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب

محض ہمارے ردِّ عمل کا قصور ہے ورنہ زندگی کے دامن میں نئے پہلوؤں کے قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لئے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے تازہ پہلو دکھاتا ہے، جنھیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ اور جو ہمارے لئے گویا موجود ہی نہیں تھے۔ اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والے اور ایک غیر ملکی سیّاح کے رجحان میں قریبی مماثلت بھی دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح ایک سیّاح کو کسی نئے ملک کی بہت سی ایسی انوکھی باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں جو اہلِ وطن کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے اُن تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لئے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریق اختیار کرنا جانتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بلندی پر سے زندگی کے بظاہر اعلیٰ اور بلند مظاہر کی پستی کا ایک تصوّر قائم کرتا ہے یا ایک شریر آئینے میں سے ماحول کا بگڑا ہوا منظر دکھاتا ہے یا پھر زندگی کے تسلیم شدہ قواعد و ضوابط پر نظرِ ثانی سے ہمیں چونکانے لگتا ہے۔ بہر صورت اس کا کام تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنا ہے اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لئے آزادی دلانا ہے تاکہ ہم غیر جانب دارانہ طریق سے زندگی کے روشن اور تاریک رُخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے اس کے علاوہ وہ کوئی مکمّل نقطۂ نظر پیش کرنے، اصلاح دینے یا اپنے شدید جذباتی ردِّ عمل سے آپ کو متاثر کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہے اور آپ کو

ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض انگریزی مضامین کے عنوانات دیکھئے کہ کس طرح انشائیہ لکھنے والے نے زندگی کی عام ڈگر سے ہٹ کر زندگی کے دیوانہ وار بڑھتے ہوئے قافلے پر ایک نظر ڈالی ہے اور ایک انوکھی صنفِ ادب کا سہارا لے کر ناظر کو بھی اپنے تجربے میں شامل کر لیا ہے۔ عنوانات ہیں:

IN PRAISE OF MISTAKES — Robert Lynd

ON THE PLEASURE OF NO LONGER BEING YOUNG — G. K. Chesterton

WHY DISTANT OBJECTS PLEASE — Hazlitt

ON THE IGNORANCE OF THE LEARNED — Hazlitt

یہ عنوانات اس بات پر دال ہیں کہ انشائیہ کا خالق اپنے موضوع کے انتخاب میں جدت سے کام لیتا ہے۔ تاہم بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ انشائیہ کا خالق مضمون کے تار و پود میں بھی ایک خوش گوار تازگی کو برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ کے مطالعہ کے بعد ناظر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرت کی بہت سی منازل طے کر آیا ہے —— غور کیجئے تو انشائیہ کی امتیازی صورت ایک بڑی حد تک اسی "خوشگوار تازگی" کی رہینِ منت ہے۔

انشائیہ کے بنیادی محاسن کو اُجاگر کرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اُردو میں انشائیہ کی صنف کے بارے میں تحقیق کی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اُردو انشائیہ نے اب تک کیا ترقی کی ہے اور مستقبل میں اس کے فروغ و ارتقا کے کیا امکانات ہیں۔ لیکن جب اُردو انشائیہ کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض نقادانِ ادب نے اُردو انشائیہ کے تاریخی اور تدریجی ارتقا کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ

ہے کہ اُردو میں انشائیہ کے وجود کو ثابت کرنے کی دُھن میں اُنھوں نے کسی قابلِ قدر تحقیقی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہر قسم کے طنزیہ مضامین یا غیر شخصی سنجیدہ نگارشات کو انشائیہ کا نام دے کر محض خود کو تسلی دینے کی سعی کی ہے۔ فی الواقع اُردو میں تا حال انشائیہ کی صنف بطور ایک تحریک کے معرض وجود میں نہیں آئی۔ کہیں ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے ایک لحظہ کے لئے انشائیہ کے تحت شمار کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر فوراً ہی بعض نقائص کے پیشِ نظر یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں کے بعض مضامین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم انھیں انشائیہ کے تحت شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں۔ کیونکہ سرسیّد کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے، جو انشائیہ میں نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے اندازِ بیان میں وہ تخلیقی تازگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔ تیسرے ان مضامین میں سرسیّد نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کی بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان مضامین کو انشائیہ کے زُمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ سرسیّد کے بعد انشائیہ کے ضمن میں سجّاد حیدر یلدرم اور خواجہ حسن نظامی کے نام عام طور سے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِن اہلِ قلم نے انشائیہ نویسی کی صلاحیت کے باوصف، اس صنفِ ادب کا کوئی صحیح نمونہ پیش نہیں کیا۔ سجّاد حیدر یلدرم کا مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کا ذکر ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مضمون اوریجنل نہیں بلکہ ماخوذ ہے۔ سجّاد حیدر کے بعض دوسرے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ نویسی کے تیور ضرور ملتے ہیں لیکن اِن میں سے شاید ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے "انشائیہ" کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ خواجہ حسن نظامی کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان تھا اور وہ ایک

انشائیہ نویس کی طرح زندگی کے بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم اٹھانے پر بھی مائل تھے۔ (مثلاً مچھّر وغیرہ پر ان کے مضامین) لیکن ان تمام مضامین میں انشائیہ کی دو اہم خصوصیات کا فقدان ہے۔ ایک تو ان مضامین کا لہجہ انشائیہ کے لہجے سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسرے اِن میں مصنّف کی اپنی ذات یا شخصیت اُجاگر نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ مضامین انشائیہ کے تحت شمار نہیں ہو سکتے۔ فرحت اللہ بیگ کے ہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں، جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہیں۔ مثلاً شگفتہ اندازِ نگارش اور موضوع سے مصنّف کا گہرا تعلق وغیرہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرحت اللہ بیگ کے ہاں بھی دوسرے کرداروں کی عکاسی یا واقعات کا بیان ہی انشا کا غالب ترین عنصر ہے اور اسی لئے وہ بھی اپنی ذات کے کسی گوشے کو عریاں نہیں کرتے۔ "نذیر احمد کی کہانی" اور "پھول والوں کی سیر" اُردو ادب میں زندہ رہنے والی تخلیقات ضرور ہیں لیکن اُنھیں انشائیہ کے طور پر پیش کرنا بے حد مشکل ہے۔

جدید دَور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" کے بعض ٹکڑے انشائیہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چڑیوں کے سلسلے میں مولانا موصوف کے تجربات یا قہوہ کے بارے میں اِن کا مخصوص ردِّ عمل ان ٹکڑوں میں پُرشکوہ اسلوبِ نگارش کی بجائے مولانا نے ایک ایسا ہلکا پھلکا اور شگفتہ سٹائل اختیار کیا ہے جو انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا نے اپنے اس مخصوص انداز میں کچھ زیادہ چیزیں تحریر نہیں کیں۔ اگر وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے متوجّہ ہوتے اور اپنی تحریروں سے انکشافِ ذات کا کام بھی لیتے تو یقیناً انھیں انشائیہ کے ضمن میں ایک مقامِ امتیاز حاصل ہوتا ——— جدید دور میں مضمون نگاری کو بیشک اہمیّت ملی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انشائیہ کی بجائے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ پطرس کے سارے مضامین مزاحیہ ہیں

اور کنہیا لال کپور کے بیشتر مضامین طنزیہ ہیں۔ لیکن اِن دونوں کے ہاں شاید ایک مضمون بھی ایسا نہیں جسے انشائیہ کے مزاج کا حامل کہا جا سکے۔ رشید احمد صدیقی کے ہاں اگرچہ طنزیہ انداز غالب ہے اور اِن کے مزاح کی اساس ایک حد تک لفظی اُلٹ پھیر پر بھی قائم ہے۔ تاہم اِن کے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ کے تیور ضرور مل جاتے ہیں پھر بھی ہم اِنھیں "انشائیہ نویس" تو یقیناً نہیں کہہ سکتے۔ کرشن چندر کی کتاب "ہوائی قلعے" کے بعض مضامین انشائیہ سے قریب ہیں لیکن شاید یہ زمانہ ہی طنز و احتساب کا زمانہ تھا کہ کرشن چندر نے خود کو اپنی ذات کی بجائے خارجی ناہمواریوں کی طرف متوجّہ کیا اور اسی لئے انشائیہ تخلیق نہیں کر پائے۔ اِن کے مقابلے میں فلک پیما کے ہاں انکشافِ ذات کا عنصر نسبتاً زیادہ ہے۔ اور اُن پر انگریزی انشائیہ کا اثر بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے فلک پیما کے بیشتر مضامین مختصر نوٹس NOTES کی صورت اختیار کر گئے ہیں یا مکالمے کے انداز میں ڈھل گئے ہیں۔ چنانچہ ان مضامین کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

جدید ترین دور میں انشائیہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کی بعض تحریروں بالخصوص "لمحے" اور "چمن آرائی" کو ہم انشائیہ کا نام دے سکتے ہیں۔ دوسرے مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے غوّاصی کی بجائے بیان اور مشاہدے پر نسبتاً زیادہ توجّہ صَرف کی ہے۔ پچھلے دنوں مشکور حسین یاد نے انشائیہ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دو تین ہی مضامین کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ اِن مضامین میں مشکور حسین یاد نے انشائیہ کے بنیادی محاسن کو پیشِ نظر ضرور رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ دوسرے ان کے ہاں کہیں کہیں اصلاحی رنگ بھی آ گیا تھا۔ یہ دونوں باتیں انشائیہ کے لئے مضر ہیں۔

تو یہ ہے اُردو زبان میں ایسّے کی مختصر سی داستان۔ دراصل انشائیہ کا پورے

طور سے تجزیہ کئے بغیر ہر قسم کی مزاحیہ یا نیم مزاحیہ تخلیق کو ایسے کا نام دے کر پیش کرنے کی جو روش ہمارے یہاں قائم ہوئی ہے، انشائیہ کے فروغ و ارتقا کے لئے مضر ہے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے سنجیدگی سے انشائیہ کا مطالعہ کریں، اس کی حدود کا تعیّن کریں۔ اور پھر اس میزان پر ہر اُس ادبی تخلیق کو تولنے کی کوشش کریں، جسے بطور انشائیہ پیش کیا جائے۔ میری دانست میں انشائیہ کو فروغ دینے کا یہی ایک احسن طریق ہے۔

وزیر آغا

(۱۹۶۱ء)

پگڈنڈی

راہِ راست برو گرچہ دُور است ——— اس مقولے میں کس قدر سچائی ہے!
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میرے ایک مہربان اُستاد تھے جو ازراہِ نصیحت ہمیشہ یہ مقولہ مجھے سناتے اور کہتے ——— بیٹا! یاد رکھو۔ زندگی کی ساری کامیابی سیدھی سڑک اختیار کرنے میں ہے۔ مقولے کے "زنِ بیوہ ....." والے حصّے کا ورد کرتے ہوئے میں نے انھیں کبھی نہیں سُنا۔ اس وقت تو مجھے اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن آج میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تاہم خاطر جمع رکھئے اس راز میں آپ کو شامل نہیں کروں گا۔ بہرحال جب بھی یہ مقولہ سامنے آتا ہے، تو مجھے اپنے یہ استاد جی یاد آجاتے ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میرے یہ اُستاد بحیثیتِ انسان کس قدر بد ذوق تھے۔ سیدھی سڑک پر تو صرف قیدی چلتے ہیں، بابو لوگ چلتے ہیں، تہذیب اور قانون کے کارندے چلتے ہیں۔ انسان کو تو سیدھی سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی اختیار کرنی چاہیئے۔

پگڈنڈی اختیار کرنے میں بڑا لطف ہے۔ آپ کے سامنے زمین کا ایک طویل و عریض خطہ ہے۔ جس میں آپ اپنے قدموں سے ایک نئی راہ تراشتے ہیں۔ سڑک کو تو ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے ہوئے قدموں نے روند روند کر سیدھا کر دیا ہے۔ حتّٰی کہ جب آپ بھی اُن

قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں تو سڑک کی ہیئت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن جب آپ پگڈنڈی اختیار کرتے ہیں تو اپنی فطری متلوّن مزاجی کا بیّن ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اور اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ شاید اسی لیئے پگڈنڈی سڑک کی طرح سیدھی نہیں ہوتی۔ اس میں انسانی مزاج کے سارے پیچ وخم نمودار ہو جاتے ہیں یہ چلتی ہے، رکتی ہے، ہٹتی ہے، سیدھی ہوتی ہے اور پھر یکلخت مُڑ جاتی ہے۔ درختوں سے خود کو بچا کر، چٹانوں سے کترا کر، کھیتوں کو چیر کر، ہر قسم کے نشیب و فراز سے ہم کنار ہوتی بڑھتی چلی جاتی ہے —— سڑک پر چلتے ہوئے آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ تنہا نہیں ہیں، آپ کے ساتھ ایک مشتعل ہجوم ہے، دوست احباب، عزیز و اقارب، اپنے بیگانے سب لوگ ہمراہ ہیں۔ ترشا ترشایا ہوا راستہ ہے، ڈھلی ڈھلائی گھاتیں ہیں، بنے بنائے اصول اور جچی تلی باتیں ہیں۔ لیکن پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کوئی بات بھی قانون اور ضابطے کے تابع نہیں۔ آپ گویا پہلے انسان ہیں جو ملاءِ اعلیٰ سے جھگڑ کر، فرشتہ پن سے مایوس ہو کر، اس خطۂ ارضی پر اُتر آئے ہیں اور اب آپ کے سامنے نہ کوئی منزل ہے اور نہ نشانِ منزل اوپر آسمان کی بے کنار وسعتیں ہیں، نیچے زمین کا فراخ سینہ ہے۔ آپ کے ہاتھ میں چھڑی اور لبوں پر سیٹی ہے۔ اور آپ کسی ذی روح کا سہارا لیئے بغیر خراماں خراماں بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ سڑک آپ کو راستہ دکھاتی ہے، منزل کا نشان بتاتی ہے، ہمراہیوں کا سہارا دلاتی ہے۔ لیکن پگڈنڈی کو آپ خود راستہ دکھاتے اور خود سہارا دیتے ہیں۔ پگڈنڈی اختیار کرنے میں یہی سب سے بڑا لطف ہے!

ہم میں سے قریب قریب ہر شخص سیدھی سڑک کے رحم وکرم پر ہے اور ہم میں سے بیشتر کی عمریں اس سیدھی سڑک پر چلتے چلتے بیت جاتی ہیں۔ جب کبھی ہم اس سڑک پر سے اترنے کی کوشش کرتے ہیں تو سماج کا گلّہ بان ہمیں ملامت اور پھر درشتی سے ٹوک دیتا ہے اور ہم جلدی سے مڑ کر سیدھی سڑک پر بڑھتے ہوئے گلّے میں کھو جاتے ہیں۔ بعض لوگ جرأتِ رندانہ کا ثبوت دینے کے لئے سڑک کو چھوڑ کر پگڈنڈی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نفس کی تیلیوں سے یہ لوگ اس قدر مانوس ہوتے ہیں کہ انھیں پگڈنڈی کی دنیا

راس نہیں آتی اور وہ بھاگ کر سڑک کی آغوش میں پھر سے پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے اپنے ایک ریٹائرڈ فوجی دوست کا ذکر کرنا ہے، جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر اتوار کی صبح کو شہر سے پانچ میل دُور کھیتوں میں سیر کے لیے جاتے ہیں۔ وہ فوجی انداز سے مارچ کرتے ہوئے جاتے ہیں، جیسے کوئی مہم سَر کرنے جا رہے ہیں اور فوجی انداز ہی سے مارچ کرتے واپس آجاتے ہیں۔ گویا محاذِ جنگ سے انھیں "باقاعدہ پسپائی" کا حکم ملا ہو۔ اِن صاحب کے لئے پگڈنڈی اختیار کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ کیونکہ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پر سڑک ہی پر چل رہے ہوتے ہیں۔ پگڈنڈی پر چلنے کا تو بڑا اصول ہی یہ ہے کہ آپ سڑک کے تصورات کو فراموش کر دیں، ذہن کے بلیک بورڈ سے سڑک کے سارے نقوش مٹا دیں اور پھر پگڈنڈی کو اجازت دیں کہ وہ اس بلیک بورڈ پر اپنے نقوش ثبت کرے۔ اس کا آسان طریق یہ ہے کہ آپ پگڈنڈی اختیار کرنے سے پہلے اپنی گھڑی مجھے عنایت کر دیں، (گھبرائیے نہیں! یہ آپ کی امانت ہے۔ جو میرے پاس محفوظ رہے گی اور سیر کے اختتام پر آپ کو لوٹا دی جائے گی) ——— گھڑی سے سبکدوش ہونا بظاہر ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن دراصل یہ ایک انقلابی قدم ہے جو آپ کو سڑک کی بندشوں اور حد بندیوں سے فی الفور نجات دلائے گا اور آپ وقت کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی اختیار کرنے سے قبل میں ہمیشہ سب سے پہلے اپنی گھڑی کو خیرباد کہتا ہوں اور اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے گویا منٹوں اور گھنٹوں کا ایک مصنوعی بوجھ تھا جو میرے شانوں سے اتر گیا ہے اور میں سبک خرام، تازہ دم اور ہلکا ہو گیا ہوں۔ پگڈنڈی پر چلنے سے پہلے ہوا کے جھونکے کی طرح سبک اور ہلکا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر وقت کا بندھن آپ کے پاؤں میں زنجیریں ڈالے گا۔ اور آپ سڑک سے بہت دور نہیں جا سکیں گے۔

پگڈنڈی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ آپ آہستہ روی کی عادت ڈالیں اور بڑے مزے سے خراماں خراماں بڑھتے چلے جائیں۔ چاہیں تو کسی پتھر یا گھاس کے قطعے پر بیٹھ جائیں۔ چاہیں تو کسی گھنے چھتنار کے نیچے لیٹ کر سبز پتّوں کی کائنات ہی کھو جائیں، اور چاہیں تو کسی پھولوں بھری ڈھلوان

میں گھٹنوں تک دھنس جائیں۔ لیکن یہ سارا عمل ایک بے ارادہ آہستہ روی کے تحت ہو اور آپ کی حرکات و سکنات سے قطعاً یہ بات مترشح نہ ہو کہ آپ کی یہ آوارہ خرامی گھڑی کی ٹک ٹک کے تحت ہے یا یہ کہ وقت کا بوڑھا گڈریا کاندھے پر لاٹھی رکھے آپ کے تعاقب میں بڑھا چلا آرہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہنسنے، رونے، گانے یا بہ آواز بلند گفتگو فرمانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ باتیں کچھ سیدھی سڑک پر ہی زیب دیتی ہیں۔ پگڈنڈی پر ان حرکات سے متاثر ہونے والا کوئی نہیں۔ البتہ ان سے آپ کو نقصان یہ پہنچتا ہے کہ آپ پگڈنڈی کی دنیا کو ابھرنے سے روک دیتے ہیں۔ پگڈنڈی سے لطف اندوز ہونے کے لئے خاموشی اشد ضروری ہے اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ چند ہی لمحوں کی خاموشی کے بعد پتوں، جھاڑیوں، غاروں اور گھاس کے قطعوں سے متجسس نظریں جھانکنے لگتی ہیں اور جگہ جگہ سرسراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ گویا آپ خاموش ہوتے ہیں تو جنگل بیدار ہو جاتا ہے۔ اور آپ ریشمیں چلمن کو اُٹھا کر فطرت کے اِس پُراسرار محل میں جھانکنے لگتے ہیں۔ خاموشی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آپ کے ہونٹوں پر مُہر لگتی ہے۔ تو دل کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ انسان کا دل بالکل ایک جنگل کے مانند ہے۔ اس کی آواز اسی وقت سنائی دے گی جب آپ اپنے ہونٹوں پر قفل لگالیں گے اور شور و شغب سے دُور رہٹ کر ایک لحظے کے لئے ساکت ہو جائیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے اوتار، پیغمبر یا فن کار نے دل کی اس آواز کو سُننے کے لئے سیدھی بارونق سڑک کو ترک کر کے اپنے لئے ایک خاموش سی پیچ و تاب کھاتی ہوئی پگڈنڈی دریافت کی ہے۔

ابھی ابھی میرے ایک "پہلوان" دوست نے مجھے پگڈنڈی پر چلنے کے بعض دیگر فوائد کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ پگڈنڈی پر سیر کرنے سے ورزش ہوتی ہے اور خُون پیدا ہوتا ہے۔ تازہ اور کھلی ہوا سے پھیپھڑوں کی قوت بڑھتی ہے اور دق سل سے نجات ملتی ہے وغیرہ ——— افسوس کہ اس بارے میں میری اپنی معلومات کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں ——— جو صاحب مضمون کے اس پہلو کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں، میرے دوست سے رجوع کریں یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی قریبی ڈاکٹر سے مشورہ کریں دونوں صورتوں میں نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے!

بہادری

بہادری اور نادانی میں کوئی بڑی خلیج حائل نہیں۔ جرأت کی ہر مثال در اصل نادانی کی ایک مثال ہے۔ جذبہ جب مند زور ہو جاتا ہے اور اس پر تہذیب اور شعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو لوگ اسے بہادری کا نام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہادری کا کارنامہ کبھی کبھار ہی سرانجام پاتا ہے۔ اور بیشتر اوقات جب کوئی فرد کسی معاملے میں جرأت کا ثبوت دے بیٹھتا ہے تو پھر وہ بقیہ زندگی ہزاروں بزدلانہ افعال سے اس کی تلافی میں مصروف رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جرأت مندانہ عمل محض ایک لمحۂ خود فراموشی کی پیداوار تھا اور بعد ازاں جب وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور و خوض کرتا ہے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر کبھی عمر بھر بہادری کا مرتکب نہیں ہوتا۔ مجھے آج تک بہادری کی سچی مثال سوائے سرکس کے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ سرکس میں کام کرنے والا ہر روز اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں ایک رسّی سے دوسری رسّی اور ایک بانس سے دوسرے بانس کی طرف کودتا ہے۔ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تماشائیوں کے لئے تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرتا ہے لیکن تماشائی اسے جرأت اور بہادری کا کارنامہ قرار دینے کی بجائے محض بازی گری کی ایک مثال قرار دیتے ہیں۔ اِن لوگوں کی دانست میں بہادری کا کارنامہ وہ ہے۔ جب کوئی کسی کو بچانے کے لئے اندھا دھند کنویں میں چھلانگ لگا دے یا شیر کے منہ میں ہاتھ

ڈال کر اپنی جانِ عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سوچئے کیا اسی کا نام بہادری ہے؟ مجھے تو یہ اوّل درجہ کی حماقت نظر آتی ہے۔ اپنی جانِ عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھنا اور وہ بھی ایک لمحاتی جذبے کے تحت، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے!

بہادری کی اس جذباتیت کے مقابلے میں کسی بھی بزدلانہ فعل کا جائزہ لیجئے، آپ کو اس میں سکون و تحمل، بردباری اور فراست صاف طور سے جھلکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ انسان اور حیوان کا فرق بھی بہادری اور بزدلی کی لکیروں ہی سے واضح ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے حیوان اور انسان کے فرق کو واضح کرنے کے لئے انسان کی ظرافت کو اس کا امتیازی نشان قرار دیا ہے، یعنی یہ جو آپ آئے دن "بے فکروں" کو ہوٹلوں اور سڑکوں پر بے ہنگم قہقہے لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں، ان لوگوں کی دانست میں، اسی میں انسان کی عظمت پنہاں ہے ——— بعض لوگ انسان کو اس کے سماجی شعور کی بنا پر حیوان سے متمیّز کرتے ہیں۔ حالانکہ حیوان بیچارے نے تاحال انسان سے کہیں بہتر سماجی شعور کا مظاہرہ کیا ہے لیکن حیوان آخر حیوان ہے۔ اس کی برتری کو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ ——— ایک طویل سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حیوان اور انسان کے فرق کو تاحال واضح نہیں کیا جا سکا۔ ہاں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ حیوان اپنے جذبے کی بے لگامی کے باعث بہادری کا مرتکب ہوتا ہے لیکن انسان اپنی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کے باعث بعض حسین بزدلانہ افعال سرانجام دیتا ہے تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے دراصل بہادری کا تصوّر محض حیوانی زندگی کی یادگار ہے اور چونکہ یہ تصوّر اس کے خون میں رچا ہوا ہے، اس لئے انسان نے غیر ارادی طور پر اسے ایک نیک عمل قرار دیا ہے اور پہلی جماعت کے قاعدے میں ایک پورا "سبق" اس کی تعریف میں لکھ کر اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کو خوش کرنے کی سعی کی ہے۔ ویسے عملی طور پر انسان روز بروز اس کہنہ تصور کو ترک کرتا جا رہا ہے۔ اور عام زندگی میں اپنی سُوجھ بُوجھ تجربے اور فراست کی مدد سے ہر ایسی حرکت سے اجتناب کرنے لگا ہے جو بہادری کے قدیم تصوّر سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ جتنا باشعور اور مہذّب کوئی فرد ہوگا، اتنا ہی وہ بہادری سے بیزار اور بزدلی کا گرویدہ ہوگا اور کبھی کسی بے لگام جذبے کے تحت کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہوگا، جس پر بعد ازاں اسے پشیمان ہونا

پڑے۔

کہتے ہیں دنیا میں سب سے بڑا عیب ریاکاری ہے۔ انسان کا اصولاً بہادری اور عملاً بزدلی کی طرف راغب ہونا ریاکاری کی ایک ایسی مثال ہے، جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ دراصل انسان اب ذہنی ارتقا کے ایک ایسے مقام تک آ پہنچا ہے جہاں وہ آسانی سے بہادری کے طلسم کا پردہ چاک کر سکتا اور بغیر کسی شرم یا جھجک کے اس بات کا اعلان کر سکتا ہے کہ بہادری کوئی قابلِ عزّت یا قابلِ تعریف فعل نہیں۔ پھر کیوں اس کارِ خیر میں تاخیر کی جائے! کیوں نہ ہم آج سے یہ مصمّم ارادہ کر لیں کہ آیندہ کبھی جرأت کے کسی عمل پر آفریں! آفریں! کا شور بلند نہیں کریں گے۔ بلکہ ہمیشہ اس کی مذمّت کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیں گے۔ جب پردۂ فلم پر کوئی پہلوان نما ہیرو گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا آئے گا اور گتّے کی تلوار کے ایک ہی وار سے بیس۲۰ ڈاکوؤں کو آنِ واحد میں موت کے گھاٹ اتار کر اور ہیروئن کو ان کے چنگل سے نکال کر مشاعرے کے شاعر کی سی داد طلب نگاہوں سے کیمرے کو گھورتا ہوا گزرے گا، تو ہم اپنے مسلک کی حمایت میں حوصلہ افزا نعروں سے اس کا سواگت نہیں کریں گے، بلکہ اپنے گلے کی پوری قوّت سے ہیرو کی حماقت اور اوچھے پن پر شیم شیم! کے نعرے بلند کریں گے۔ دوسری طرف جب کوئی غیر مہذّب اور تنومند بیوی اپنے دُبلے پتلے مہذّب اور مرنجاں مرنج شوہر پر طنز و مزاح کے علاوہ بعض دوسرے غیر مہذّب حربے استعمال کرے گی اور شوہر جوابی حملہ کرنے کے بجائے "زاحتقاں بگریز" پر عمل کرتے ہوئے بیوی کی ساری کارروائی کا ایک ابدی سکوت سے جواب دے گا، تو ہم بیوی کی جرأت کو محض ایک حیوانی عمل قرار دیں گے اور شوہر کے انکسار، فراست اور تہذیب کو انسان کے ذہنی ارتقا کا ایک ادنیٰ کرشمہ قرار دیتے ہوئے آفرین! آفرین! کے فلک شگاف نعروں سے سینما ہال میں کہرام برپا کر دیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری یہ کارروئی ایک انتہائی عمل کا نمونہ ہوگی۔ جس کے نتیجے میں شاید ہمیں قبل از وقت ہی سینما کی عمارت سے باہر بھی نکلنا پڑے۔ لیکن اگر ہماری نیت نیک ہے اور مسلک انسان کو قعرِ جہالت سے باہر نکالنا تو پھر اس نیک کام میں جھجک یا تکلف کو ہرگز راہ نہیں دینی چاہیئے۔ یاد رکھئے آپ

ایک اعلیٰ مشن کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اس معرکے میں اگر آپ کامیاب ہو گئے تو سبحان اللہ، ورنہ آپ کی رحلت کی صورت میں کم از کم کچھ رجعت پسند لوگ اسے بہادری کا کارنامہ تو قرار دیں گے۔ دونوں صورتوں میں آپ کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔

بہادری ایک ناتراشیدہ جذبہ ہے ——— جذبہ جو سطحیت میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کے پس منظر میں کسی ذہنی ارتقا کے نقوش نہیں ملتے۔ اس کے برعکس بزدلی انسان کے تدریجی ذہنی اور سماجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ آج شاید لوگ اس کی اہمیت کا پوری طرح احساس نہ کر سکیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آگے چل کر بزدلی کو زبردست اہمیت ملنے والی ہے۔ نثری نظم کی طرح بزدلی بھی مستقبل کی چیز ہے۔ چنانچہ وہ دن دُور نہیں جب بہادری کا ہر کارنامہ قابلِ دست اندازیٔ پولیس قرار پائے گا اور بزدلی کے ہر فعل پر قوم کی طرف سے انعامات تقسیم ہوا کریں گے۔ جب کوئی سر پھرا بھونکتے ہوئے کُتّے سے دست و گریبان ہو کر اپنی ٹانگ پر محبّت کی مُہر ثبت کرائے گا تو اس کے خلاف نقصِ امن کے تحت مقدمہ چلا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شریف آدمی اپنی طبعی شرافت اور انکسار کو بروئے کار لا کر کتّے کو دیکھتے ہی قریبی درخت کی طرف حیرت انگیز عجلت اور تیزی سے لپکے گا۔ اور اس کی سب سے اونچی شاخ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عرصے تک لٹکا رہے گا، تو اسے صبر و تحمل، سماجی شعور اور فراست کا مجسمہ قرار دیا جائے گا اور اس کے اس کارنامے پر قومی اخبارات میں لیڈنگ آرٹیکل چھپا کریں گے اور خود اس پر عوام کے انعامات کی بارش ہوا کرے گی۔

پس چونکہ دنیا میں ترقی حاصل کرنے کے لئے زمانے کے نئے میلانات کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اس لئے آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ بہادری جیسے فرسودہ اور کہنہ جذبے کو خیرباد کہہ کر انسانی فراست اور تدبّر کے حق میں آواز بلند کریں اور انسان کے گرتے ہوئے اخلاق کو اپنی بُزدلی کی انمول صلاحیتوں سے سہارا دینے کی پوری سعی کریں۔ اسی میں آپ کا اور نسلِ انسانی کا بھلا ہے !!

خاموشی

کبھی آپ کو آواز سے محروم ہونے کا خوش گوار تجربہ ہوا ہے! ——— مجھے ہوا ہے اور محض چند لمحوں کے لئے نہیں، بلکہ پچھلے دس روز سے قوتِ گویائی سے محروم ہوں۔ کہنے کو تو دس روز کا عرصہ کچھ زیادہ طویل نہیں، لیکن اگر آپ کے ہونٹوں پر ابدی چُپ کی مُہر لگی ہو تو ہر لمحہ پھیل کر صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے اور وقت کی صبا رفتار گاڑی کے پہیے اچانک رک جاتے ہیں۔ یا شاید اس طرح نہیں ہوتا بلکہ محسوس یوں ہوتا ہے گویا ریل تو چل رہی ہے، صرف آپ رک گئے ہیں۔ اور اگر آپ سائنس کے اصولوں سے ذرا بھی واقف ہیں تو آپ کو اس عمل کے نتیجے سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ آپ نے ٹکٹ گم کر دیا تھا سو آپ کو گاڑی سے نیچے اُتار دیا گیا ہے۔ اس سے فرق یہ پڑا ہے کہ پہلے آپ ریل کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے منظر کو دیکھ رہے تھے اور اب آپ منظر کی طرف پشت کئے گزرتی ہوئی ریل کو دیکھ رہے ہیں۔

جس روز گلے کی خرابی کے باعث میری آواز اچانک بیٹھ گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں انتہائی سرعت سے کسی منزل کی طرف رواں دواں تھا، اور اب کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ٹھہرا لیا ہے ——— لیکن میرے ساتھی ہیں کہ اسی

تیزی اور سُرعت سے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ جب تک میں خود بھی اس بڑھتے ہوئے مشتعل انبوہ کا ایک فرد تھا، مجھے اس کی تیزی اور بے قراری کا احساس ہرگز نہیں تھا۔ لیکن جونہی میں چند لحظوں کے لئے رُکا، مجھے دوسروں کی حرکات و سکنات میں ایک غیر معمولی تیزی اور بے قراری نظر آنے لگی ——— عجیب منظر تھا۔ گاڑی اُڑی چلی جا رہی تھی۔ گاڑی کے پہیّوں سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں اور گاڑی کے مسافر ڈبوں سے چمٹے، چیختے چلاّتے گزرے چلے جا رہے تھے ——— لیکن میں ایک ٹیلے پر چُپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

پچھلے دس روز سے میں اسی ٹیلے پر کھڑا ہوں۔ شروع شروع میں تو خاصی اُلجھن محسوس ہوئی تھی۔ آواز جو سینے کی گہرائی سے اپنی تمام تر غنائیت اور موسیقی کے ساتھ برآمد ہوتی تھی، گلے تک پہنچتے پہنچتے سرگوشی اور لبوں تک آتے آتے ایک شکستہ چیخ میں تبدیل ہو جاتی تھی اور میں سٹپٹا کر رہ جاتا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ گویائی کی جگہ سماعت نے لے لی، اور میں آواز نکالنے کی بجائے آواز سننے کی طرف راغب ہونے لگا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ اس ذرّہ ناچیز پر جسے ہم "زمین" کہتے ہیں۔ آوازوں کا ایک محشر برپا ہے۔ باریک، کمزور آواز سے لے کر بھاری بھرکم آواز تک اور نغمے کی مدھر الاپ سے لے کر کان کے پردے پھاڑ دینے والے شور تک ——— آواز کا ایک سیلِ رواں موج زن ہے۔ ہر آواز دوسری آواز کو دبا رہی ہے۔ ہر سُر دوسرے سُروں پر چھا جانے کی کوشش میں ہے اور جہد للبقا کا اصول اپنی پوری شدت کے ساتھ یہاں بھی کارفرما ہے۔

آواز کا یہ رُوپ میرے لئے اس قدر نیا اور انوکھا تھا کہ میں نے سوچا مجھے اس کو محفوظ کر لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اسے ایک نظم میں ڈھال لیا۔ اس نظم کی ہیروئن "خاموشی" تھی۔ جو صبح و شام ایک کاسۂ گدائی ہاتھ میں لئے ہر نیم باز دروازے تک جاتی تھی لیکن اسے کوئی بھی گوشۂ عافیت نظر نہیں آتا تھا ——— پھر وہ دروازوں سے مایوس ہو کر بازاروں کا چکّر لگاتی تھی اور ہر گزرنے والے کے ساتھ تھوڑی دور چل کر رُک جاتی تھی لیکن کوئی بھی اُسے عافیت کی بھیک نہیں دیتا تھا، چاروں طرف شور تھا، ہنگامہ تھا، شوریدہ سری تھی۔ ہر

ذہن پر انتشار کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ہر گھر میں ایک ہنگامۂ محشر برپا تھا۔ خاموشی بھٹک رہی تھی۔ لیکن اسے جنتِ گم شدہ کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔

جب گویائی کی جگہ سماعت نے لے لی تو سب سے پہلے مجھے کائنات میں آواز کی فراوانی کا احساس ہوا۔ پھر یہ خیال آیا کہ آخر اتنی ساری آواز کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا اس سے کم یا بہت کم آواز ہمارے لئے کافی نہیں؟ مجھے اس ڈاکٹر کا قول یاد آیا جس نے کہا تھا کہ ہمارے معدوں کو اتنی خوراک کی ہرگز ضرورت نہیں جتنی ہم انھیں فراہم کرتے ہیں۔ دراصل ہم محض عادتاً زیادہ کھاتے ہیں اور معدے کو اس کی ہمت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ غالباً یہی حال آواز کا ہے۔ ہمیں اتنا بولنے کی ہرگز ضرورت نہیں، جتنا ہم بولتے ہیں۔ آواز سے محروم ہونے پر ہی مجھے اس حقیقت کا علم ہوا ہے کہ کم بولنا اصولاً نہیں، بلکہ واقعتاً بڑا ضروری ہے۔ مثلاً ان چند دنوں میں مجھے کئی بار کوئی ایسی خاص بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جو میرے خیال کے مطابق بے حد اہم تھی اور جس کے اظہار کے بغیر میں رہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن جب دو چار گھنٹوں کے بعد اس بات کی باری آئی ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ اس پر سانس خرچ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ عام زندگی میں بھی آپ دیکھئے کہ بچے زیادہ بولتے ہیں اور عورتیں مسلّمہ "زبان آور" ہیں، اور زیادہ بولنے والے اپنی ذہنی مفلسی کی غمازی کرتے ہیں۔ صوفیا نے یونہی تو "عقلِ کل" کو مجسّم خاموشی سے تعبیر نہیں کیا۔

میں نے ان دس روز میں معمول سے کچھ زیادہ ہی سوچ بچار کی ہے۔ عام حالات میں تو خیال کی پیدائش اور زبان کی جنبش میں کوئی طویل وقفہ حائل نہیں ہوتا۔ لیکن میرا معاملہ جُدا تھا، یہاں ہر لمحہ نئے سے نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے لیکن خزینۂ دل کے دروازے مقفّل تھے، اور ان کے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ تاہم مجھے اِس سے ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ میرے ذہن کی جھیل جو اکثر پایاب رہتی ہے، لمحہ بہ لمحہ بھرنے لگی اور الجھنوں اور دشواریوں کے ذرّات تہہ میں بیٹھنے لگے۔ اس سے جھیل کا پانی شفاف ہو گیا اور نظر اس کی گہرائیوں تک اترنے لگی۔ چنانچہ میں نے اس عرصے میں زندگی اور کائنات کو ایک ایسے نئے زاویے سے دیکھا کہ عام حالات میں شاید مجھے اس کی توفیق نہ ہو سکتی۔ مجھے کرشن چندر کا کبالا یاد آ گیا لیکن کبالا کے دل میں تو

محبّت کا سمندر موجزن تھا اور زبان اُس کا ساتھ دینے سے عاجز تھی ——— اور میری زبان گنگ تھی لیکن دل میں فقط ٹھہرے ہوئے پانی کی ایک جھیل تھی۔ یہاں کوئی طوفان نہیں تھا، کوئی لہر نہیں تھی، کوئی خروش نہیں تھا، بس لمحہ بہ لمحہ جھیل گہری ہوتی جا رہی تھی اور میں اس کی پنہائیوں میں "پا برہنہ و سر اسیمہ سے اک جمِ غفیر" کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

میرا گلا اب کچھ بہتر ہونے لگا ہے۔ چند روز میں مجھے قوّتِ گویائی دوبارہ نصیب ہو جائے گی۔ لیکن یہ تجربہ مجھے کبھی فراموش نہیں ہو سکے گا۔ میں نے اِن چند دنوں میں زندگی کے ڈرامے کا ایک ادنیٰ کردار ہونے کے باوجود اس ڈرامے کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ایسی خوش قسمتی روز روز کہاں؟ (ہر روز رہے تو یہی بدبختی ہے!) اہلِ معرفت کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر زندگی کی ہماہمی اور بے قراری و شوریدہ سری میں گھرے ہوئے، کسی روشن مینار کی طرح ساکن ہو جاتے تھے۔ گویا چند لمحوں کے لئے رُک جاتے تھے اور ان کا یہ رُکنا رُوحانی تجربہ کہلاتا تھا ——— لیکن شاید یہ لوگ اس طور رُکتے تھے کہ ان کے اور زندگی کے درمیان بہت سے رشتے منقطع ہو جاتے تھے اور وہ اس لمحۂ تابناک میں زندگی کے سیلِ رواں سے محظوظ نہیں ہو سکتے تھے ——— میرا تجربہ ان سے مختلف ہے۔ میں اُنہی کی طرح چند لمحوں کے لئے رُکا تو ہوں لیکن ساتھ ہی میں نے زندہ و شاداب، چیختی اور چلّاتی ہوئی زندگی کا تماشا بھی دیکھا ہے، کیا یہ تماشا انہیں بھی کبھی نظر آیا تھا؟

چھکڑا

انسانی ذہن بھی عجیب ہے! کوئی بھولی بسری بات یاد کرنا چاہو تو اس قدر بے نیاز ہو جاتا ہے گویا تم سے واقف ہی نہیں اور اگر شامتِ اعمال سے کوئی بات بھلانا چاہو تو بضد ہو جاتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ آج صبح سے میں اپنے ذہن کی اسی ضد کا شکار ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بات بھول جاؤں، اس مخمصے سے رہائی پاؤں لیکن میری ہر تازہ کوشش پر ذہن برہم ہو جاتا ہے۔ اور اس کا اشارہ پاتے ہی بات کا عنکبوت میرے گرد کچھ اور ریشمی تار بُن دیتا ہے۔ تنگ آ کر میں نے مدافعت کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ سوچنا تو ہے ہی! اگر ذہن بضد ہے تو اسی کی بات سہی ـــــ لیکن یہ بات بے ڈھنگی ضرور ہے، یعنی ہمارے قومی کردار کا علامتی مظہر کیا ہے؟ کوئی کہے بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ لیکن بات شاید اتنی مضحکہ خیز بھی نہیں۔ آخر کوئی نہ کوئی علامتی مظہر تو ضرور ہو گا۔ سوچئے اگر زمین کے اس بے ڈھنگے فٹ بال کا ایک گمنام سا گوشہ ہمارا اپنا ہے تو اس کی خاک کی تاثیر اور پانی کا ذائقہ بھی تو اپنا ہو گا اور پھر منطق کی رو سے اس تاثیر اور ذائقے کا کوئی علامتی مظہر بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہو گا۔ کوشش کرنی چاہئے۔ شاید گوہرِ مقصود ہاتھ لگ جائے۔

یوں علامتی مظہر کا قصّہ کوئی نیا بھی نہیں۔ انگریز کو لیجئے۔ اُس نے اپنے قومی کردار کے لئے کیسی خوبصورت علامت وضع کی ہے! ——— "جان بُل" میں وہ سب کچھ ہے جو انگریز کے کردار سے خاص ہے ——— طمانیت، عُجلت پسندی اور قوّت! کئی سال کی بات ہے، میں نے جان بُل کے علامتی مظہر کو ایک کارٹون کے رُوپ میں دیکھا تھا۔ کارٹون کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ جان بُل کے چہرے سے خشونت کی بجائے تبسّم مترشح تھا۔ بُل صاحب ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور اُن کی توند بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ میز پر شراب کی بوتل پڑی تھی اور ماحول پر سکون، طمانیت اور سیر چشمی چھائی ہوئی تھی۔ انگریز کے قومی کردار کی اس سے بہتر کوئی تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ امریکی کا معاملہ انگریز سے قدرے جُدا ہے۔ امریکی شاید ازل کا آوارہ گرد ہے۔ اس کے پاؤں میں چکّر ہے، ایک جگہ کا ہو رہنا اُسے گوارا نہیں۔ پھر اس کے کردار میں کچھ یہودی پن بھی ہے۔ وہ ہر شے کی ایک قیمت مقرر کر لیتا ہے۔ اس کے قومی کردار کا علامتی مظہر چچا سام سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔ چچاؤں کی ساری قوم ہی آوارہ گردوں اور خانہ بدوشوں کی قوم ہے۔ کسی بھی برخوردار بھتیجے سے پوچھ لیجئے، وہ اپنے چچا کی پُراسرار شخصیت سے متاثر ہوگا۔ اس کا چچا جب کبھی آئے گا، اسے دُور دیس کے جھوٹے سچّے قصّے سنائے گا۔ لیکن چند روز میں ہی پاؤں کا چکّر چچا کو پھر کسی نئے دیس میں لے جائے گا۔ بھتیجے کو چچا کی کفایت شعاری کا شاید گلہ ہو لیکن چچا بے چارہ کیا کرے۔ بھتیجوں کی قوم بھی تو پرلے درجے کی فضول خرچ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ چچا کو اپنی پائی پائی پر مہر لگانا پڑتی ہے۔ امریکی کردار کو جس کسی نے چچا سام کے نام سے واضح کیا تھا، وہ ایک قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت کا انسان تھا۔ حیرت ہے کہ اسے نوبل پرائز کا مستحق کیوں نہ قرار دیا گیا۔

امریکی اور انگریز تو خیر سات سمندر پار کے رہنے والے ہیں، اپنے ہمسائے میں اہلِ ہند کی طرف نگاہ اٹھائیے۔ جن کے قومی کردار کا علامتی مظہر "گائے" ہے ——— گائے، کاروباری معاملہ فہمی، عافیت کوشی اور "عدم تشدّد" کی مظہر ہے اور یہ تمام

خصوصیات ہندوستانی کردار میں موجود ہیں۔ علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ گائے کے نوکدار سینگ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ہرج ہی کیا ہے؟ اوّل تو یہ سینگ محض دکھاوے کے لئے ہیں۔ دوسرے یوں بھی ہر کسی کو اپنی حفاظت کا حق حاصل ہے۔ فطرت خود ہر شے کو اپنی حفاظت کی ترغیب دیتی ہے۔ ورنہ انسان نے ناخن، مکھی نے ڈنک اور پھول نے کانٹے سے خود کو لیس کیوں کیا؟ ——— نوکدار سینگوں کا ذکر آیا تو آپ شاید سوچیں کہ علامہ اقبال کے خیال کے مطابق، ہمارے اپنی قومی کردار کا مظہر "اونٹ" ہے۔ بیشک ایک لحاظ سے یہ بات ٹھیک ہے۔ وہ اس طرح کہ اونٹ کی طرح ہماری بھی کوئی کل سیدھی نہیں لیکن اونٹ میں بعض ایسی خصوصیات بھی تو ہیں، جن کی بناء پر وہ شاید ہمارا "علامتی مظہر" قرار دیئے جانے پر اپنی ہتک محسوس کرے۔ مثلاً اونٹ میں قناعت، صبر، ہمّت اور اولوالعزمی کی صفات موجود ہیں اور ہمیں ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ——— جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر آپ ہی بتائیے کہ ہمارا علامتی مظہر کیا ہوگا؟ ——— میں خود آج صبح سے سر پٹخ رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اس بات کو بھول جاؤں، اس مخمصے سے رہائی پاؤں۔ لیکن ذہن کی کرشمہ سازیوں کا کیا کیا جائے کہ بات کا عنکبوت مجھے اور بھی اُلجھا دیتا ہے۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی علامتی مظہر تو ضرور ہوگا۔ جب ہر ملک کو ——— ٹھہریئے ایک بات مجھے سوجھی ہے۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے، ——— ہمارا علامتی مظہر ہے ——— "چھکڑا"۔ ریل کا چھکڑا نہیں کہ اس میں تو کوئی انفرادیت ہی نہیں ہوتی۔ میری مراد موٹر چھکڑے سے ہے جسے اصطلاحِ عام میں "ٹرک" کہتے ہیں۔ اور جو میری ناچیز رائے میں ہمارا صحیح ترین نمائندہ ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہی دیکھئے کہ چھکڑے کا ظاہر و باطن ہمارے ظاہر و باطن سے کس قدر مماثلت رکھتا ہے ——— انجن ہزار رنگ آلود ہو، بریکیں جواب دے چکی ہوں، پہیے گردشِ روزگار سے ہموار ہو چکے ہوں۔ لیکن چھکڑے کے ظاہری حسن پر اس کا کوئی اثر نمودار نہ ہوگا۔ بلکہ جس قدر اس کا باطن سیاہ ہوگا ظاہر اسی

قدر جاذبِ نظر اور دامن کشِ دل دکھائی دے گا۔ کسی بھی چھکڑے کو ذرا تنقیدی نظر سے دیکھئے اس کے جسم کی خارجی سطح، کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا ایں جاست کے مصداق رعنائیوں اور بوالعجبیوں کی تفسیر پیش کرے گی۔ چمکتے ہوئے سُرخ یا سپید رنگ پر کہیں شعر لکھے ہوں گے۔ کہیں تصویریں بنی ہوں گی۔ کہیں نقش و نگار کھدے ہوں گے۔ ڈرائیور کے دائیں بائیں خوشنما ہار اور طلائی چٹلے لٹک رہے ہوں گے۔ مُڈھ پر کوئی رنگین "شاہین" آسمانی رفعتوں میں پرواز کے لئے پَر تولے بیٹھا ہوگا۔ مڈگاڈوں پر سُرخ جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی ہوں گی اور حسن و رعنائی میں ڈوبے ہوئے اس چھکڑے کے اندر میلے چکٹ کپڑے زیبِ تن کئے کوئی بھینگی آنکھ والا سیہ رو ٹرک ڈرائیور بیٹھا، افیون کی پینک میں اونگھ رہا ہوگا۔ آپ سوچیں گے ایسے خوبصورت جسم میں کیسی بدروح حلول کر گئی ہے! چھکڑا کیا ہے، یہ تو ڈاکٹر فاؤسٹ کا پیکر ہے! جس کی رُوح خوبصورت اور جوان جسم کے عطا ہونے پر اپنی بداعمالیوں کے باعث مکروہ صورت بن گئی تھی۔

اجمال کے بعد ذرا تفصیل میں جائیں تو انکشافات کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مثلاً چھکڑا ہمارے شعری ذوق کی کیسی خوبصورت ترجمانی کرتا ہے۔ آپ کسی بھی کھڑے ہوئے چھکڑے کے گرد ایک چکّر لگائیں۔ آپ کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا وافر سامان مل جائے گا۔ برف پوش پہاڑوں اور اُبلتی ہوئی ندیوں کی تصویروں کے نیچے آپ کو کچھ اس قسم کے شعر لکھے ہوئے ملیں گے۔

؎ کس کی صدا یہ آئی، کس نے مجھے پکارا
گاڑی کے روکنے کو گھنٹی کا دو اشارا

؎ یا الٰہی ڈرائیوروں کی کیا عجب زندگانی ہے
پنڈی چائے، لاہور روٹی، ملتان پانی ہے

؎ غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی!
گردوں نے گھڑی "زندگی" کی اک اور گھٹا دی

۵ دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
افسوس ہو گا تو بس یہی ہو گا کہ ہم نہ ہوں گے

ان اشعار میں ایک بے رحم حقیقت پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ ہماری طرح ہمارا چھکڑا بھی شاید ہی کبھی اپنی طبعی موت مرتا ہے۔ کسی نہ کسی موڑ پر اس کی لوحِ تقدیر پر لکھا ہوا حادثہ اس کا منتظر رہتا ہے۔ چنانچہ ان اشعار میں آنے والے واقعات کے پُراسرار سائے لہراتے ہوئے ملتے ہیں ——— بہرحال چھکڑا ہمارے شعری ذوق کی تسکین کے سلسلے میں ایک زندہ تحریک ہے اور ہمارے ایک اہم رجحان کی غمّازی کرتا ہے۔ شعر سننے بلکہ شعر کہنے کی لَت ہماری قوم کی گھٹّی میں ہے، اعداد و شمار کی عدم موجودگی کے باوجود اگر یہ کہیں کہ ہم میں سے ہر تیسرا آدمی شاعر ہے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو ——— اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ کوئی تین برس پہلے کی بات ہے۔ میں اپنے ایک شاعر دوست کے ہاں مہمان تھا۔ یہ صاحب شہر ——— "ر" میں دکاندار ہیں۔ ایک دن میں اِن کی دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک لڑکا کہیں سے بھاگا بھاگا آیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ یہ کہتا ہوا کہ ٹرنکوں والی دکان میں غزل ہو گئی ہے، لپک کر اگلی دکان میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنے میزبان سے استفسار کیا تو جواب ملا ——— "دیکھتے جاؤ"! ——— میں دیکھتا گیا۔ کوئی پندرہ منٹ کے اندر اندر سارے بازار کی دکانیں بڑھا دی گئی تھیں اور میرے میزبان بھی ایک بڑا سا تالا ہاتھ میں لئے مجھے دکان سے باہر نکلنے کی فرمائش کر رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد سارے بازار کے دکاندار (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ سارا بازار ہی شعرائے کرام کا تھا۔) ٹرنکوں والی دکان میں پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی سے ٹرنک ہٹا کر چاندنی بچھا دی گئی تھی، پاندانوں کے ڈھکنے کھُلے ہوئے تھے اور سگریٹ پیش کئے جا رہے تھے۔ پھر مشاعرہ شروع ہو گیا۔ نئی غزل متعدد بار سنی گئی اور غزل سرائی کا یہ دور رات کے پچھلے پہر تک جاری رہا ——— جب صورتِ حال یہ ہو تو ہمارے کردار کے علامتی مظہر کا ذوقِ شعر سے محروم ہونا ایک بہت بڑا سقم نہیں تو اور کیا ہے؟ شکر ہے کہ چھکڑا اس معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔

چھکڑا ذوقِ شعر کی تسکین کا ہی سامان بہم نہیں پہنچاتا بلکہ ہمارے مخصوص فلسفۂ حیات کا زندہ مظہر بھی ہے۔ اس کی پیشانی پر نگاہ ڈالئے، دونوں جانب "یا خدا" اور "یا دستگیر" کے الفاظ لکھے ہیں۔ جو ہمارے گہرے روحانی ورثے کی غمّازی کرتے ہیں۔ چھکڑے کی پشت پر "اک تیرا سہارا"، اور "پھر ملیں گے اگر خُدا لایا" کے الفاظ موجود ہیں جن کا مطلب فقط یہ ہے کہ خدا کا کرم شاملِ حال ہونا چاہئے ورنہ اپنی طرف سے ہم نروان حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے ——— فنا کا احساس ہمارے قومی کردار کے خون میں رچا ہوا ہے۔ زندگی کے حسین ترین لمحوں میں بھی ہم اپنے فانی ہونے کے احساس سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے اور موت کا تصوّر ایک بہت بڑا "اگر" بن کر ہمارے فلسفۂ حیات پر مسلّط ہو چکا ہے۔ لیکن عام زندگی میں یہ بات کہاں ظاہر ہوتی ہے؟ میں کہتا ہوں چھکڑے سے پوری طرح آشنا ہوئے بغیر اپنے فلسفۂ حیات کو سمجھنا ہی ناممکن ہے ——— چھکڑا خود زندگی کا مظہر ہے جسے ایک لمحے کو بھی قرار نہیں۔ یہ ہر دم رواں ہر دم دواں ہے! اس پر لکھے ہوئے الفاظ "پردیسی آ گیا جی"، بیک وقت اس کی آوارہ خرامی اور حسرت زا احساسِ محرومی کی تصویر پیش کرتے ہیں ——— اور یہ سب باتیں ہم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ چھکڑا شاید ازل سے بوجھ اٹھائے رواں دواں ہے۔ اور اس کے ہم زاد کے شانوں پر بھی صدیوں کا بارِ گراں ہے۔ دیکھئے اِن دونوں میں کتنا گہرا رشتہ ہے!

آندھی

ہمارے ملک کے اکثر شرفا آندھی کو ایک لعنت سمجھتے ہیں اور اس کی شان میں بعض اوقات غیر شریفانہ اور نازیبا کلمات کے استعمال میں بھی کوئی قباحت نہیں دیکھتے۔ چاہے آپ چند لحظوں کے لئے میری شرافت کو شبہ کی نظروں سے ہی کیوں نہ دیکھنے لگیں۔ میں ان شرفا کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور علی الاعلان اس بات کا اظہار کرتا ہوں (اور قاعدے کے مطابق اس اظہار میں مسرت محسوس کرتا ہوں) کہ میں آندھی کا سب سے بڑا مدّاح اور اس کے طریقِ کار کا سب سے بڑا علمبردار ہوں۔

جس طرح موسم کی پیش گوئی کرنے والے ہر سیاسی یا اخلاقی مسلک کے تحت شہر کے باسیوں کے لئے ایک قسم کا موسم اور دیہات میں رہنے والوں کے لئے ایک بالکل مختلف قسم کے موسم کی پیش گوئی کر کے دنیا اور عقبیٰ ——— دونوں میں سرخروئی حاصل کر لیتے ہیں، اسی طرح میرا یہ ارادہ ہے کہ آندھی کی برکات کے سلسلے میں "غیر مہذب" دیہاتیوں کے لئے ایک علیحدہ مضمون لکھوں اور "اہلِ فکر" کے لئے ایک علیحدہ قسم کی بحث چھیڑوں، تاکہ آگے چل کر جب مجھے قوم کا لیڈر بننے کی ضرورت لاحق ہو تو میں زندگی کے ہر شعبے سے اپنے پیروکار حاصل کر سکوں۔ چنانچہ آج میں آندھی کی برکات کے سلسلے میں صرف اہلِ فکر سے مخاطب ہوں

کہ میری دانست میں یہ طبقہ نسبتاً زیادہ خطرناک ہے۔ اور پہلے اِس طبقہ کے غلط رجحانات کا سدِّ باب ہونا ضروری ہے۔

بظاہر آندھی، پچاس ساٹھ یا ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوئی اس ہوا کا نام ہے جو ایک غولِ بیاباں کی طرح، دھول میں اٹی، اپنے بال کھولے، سیٹیاں بجاتی ہوئی آتی ہے۔ اور سوئی ہوئی زندگی کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتی اور اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کے مناظر چھوڑتی، آگے کو نکل جاتی ہے۔ لیکن آندھی کی برکتیں تعداد میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے اس کی یہ ننھی ننھی بدعنوانیاں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حیرت ہے کہ اہلِ فکر نے آج تک آندھی کو محض ایک غولِ بیاباں کے رُوپ میں دیکھا اور اس کی ان برکات سے چشم پوشی کی جنھیں میں آج منظرِ عام پر لاکر ایک زبردست انسانی خدمت سرانجام دینے لگا ہوں۔

آندھی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ جہاں یہ آپ کے دیکھنے، سننے، بولنے اور سونگھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرتی ہے، اور یوں اِن بہت سی شمعوں کو بجھا کر آپ کی حسیات پر ایک گھٹاٹوپ اندھیرا مسلط کر دیتی ہے۔ وہاں یہ آپ کے سینے کی تاریکیوں میں ایک ننھی سی قندیل بھی روشن کر دیتی ہے۔ جب سارا عالم ہوا کے وحشی جھونکوں کی زد میں آجاتا ہے۔ اور تاریکی اس قدر گہری ہو جاتی ہے کہ بقول شخصے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ نیز جب آپ یکایک اپنے ماحول سے اس طور کٹ جاتے ہیں کہ آپ کے اور قریب ہی بیٹھے ہوئے آپ کے مہمان کے درمیان گویا میلوں چوڑی خلیج حائل ہو جاتی ہے تو آپ یکایک کچھوے کی تقلید میں اپنے اندر سمٹ جانے میں ہی عافیت دیکھتے ہیں۔ اور ماحول سے اپنے تمام رشتے منقطع کر کے اور اپنی خودی کی چھوٹی سی گٹھا میں احساس و شعور کی ایک ننھی سی شمع روشن کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی آندھی کا سب سے بڑا کمال ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی روشنی پر مبذول کراتی ہے اور آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار ہونے میں مدد دیتی ہے۔ آندھی دراصل ایک "چیلنج" ہے۔ جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ اپنی تمام تر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں ——

بالکل جیسے ایک کمزور پودا ماحول کی چیرہ دستیوں کے پیشِ نظر قبل از وقت ہی پھول نکال لیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس عمل کو "غواصی" سے تعبیر کریں۔ چاہیں تو اہلِ معرفت کی زبان میں اسے "وصل" کا نام دیں۔ لیکن یہ نہ بھولیں کہ یہ کرشمہ دراصل آندھی کا ہے بات بھی ٹھیک ہے! آخر یہ جو عرب، ایران، ہندوستان اور چین نے زندگی اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیاں کیں کیا ان کا باعث ان ممالک کے لوگوں کی بعض غیر معمولی صلاحیتیں تھیں؟ ہرگز نہیں! ان کا باعث صرف یہ تھا کہ قدرت ان ممالک کو قرن ہا قرن تک آندھیوں سے نوازتی رہی اور ان کے باسیوں کی ظاہری آنکھوں میں خاک جھونک کر انھیں اپنے "اندر" کی تیرہ و تار دنیا کو منور کرنے پر اکساتی رہی۔ اس طریقِ کار کے جو شاندار نتائج برآمد ہوئے، آج وہ سلسلہ ہائے فکر کی صورت میں آپ سب کے سامنے ہیں اور کیا آپ ان نتائج سے انکار کر سکتے ہیں؟

آندھی ہمیں گیان دھیان ہی کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ خود میں لچک پیدا کرنے کی طرف بھی مائل کرتی ہے۔ اگر آپ نے آج تک آندھی سے آشنا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو میری بات مانئے اور اگلی بار جب آندھی آئے تو خود پر کسی نہ کسی طرح جبر کر کے اس کے طریقِ کار کا نظارہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ درخت اور پودے آندھی سے برسرِ پیکار ہونے کی بجائے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے چلے جاتے ہیں اور آندھی کی لہریں ان کے اوپر سے پھیلتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان میں جو درخت ضد، ہٹ دھرمی یا بزعمِ خود جواں مردی کا مظاہرہ کرتا ہے اور خود میں مناسب لچک پیدا نہیں کرتا، آندھی اس سے یوں انتقام لیتی ہے کہ اسے جڑ سے اکھیڑ کر پرے پھینک دیتی ہے۔ غور فرمائیے، اس بات میں کیسا خوبصورت سبق پنہاں ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو زمانے کی ہوا کا رُخ دیکھ کر ہی چلنا چاہئے اور جس طرف ہوا کا رُخ ہو چکے سے اسی طرف کو جھک جانا چاہئے۔ جو ایسا نہیں کرے گا اور ضد، ہٹ دھرمی اور رجعت کا ثبوت دے گا، اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ شخص بہت جلد اپنے انجام کو خود ہی پہنچ جائے گا۔ حیرت ہے کہ اہلِ فکر نے آج تک آندھی سے یہ سبق حاصل نہیں کیا اور اپنے قدیم مسلک سے

انحراف کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ نتیجہ دیکھ لیجئے۔ زمانے نے اہلِ فکر کو کس طرح جڑ سے اکھیڑ کر پرے پھینک دیا ہے اور آج ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنے ملک کے اہلِ سیاست پر نظر ڈالئے۔ جنھوں نے آندھی سے سبق حاصل کیا اور ہوا کا رُخ دیکھ کر چلے۔ اور اگر ہوا کا رُخ ذرا بھی بدلا تو ان لوگوں نے اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر سب سے پہلے اپنا رُخ تبدیل کر دیا۔ آج عزت اور ثروت ان کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ آج زمانہ ان کے قدموں کا غبار ہے۔ آج ان میں سے ہر شخص آندھی کو راستہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آندھی کا ایک آخری وصف یہ ہے کہ اس کے ذریعے فطرت وہ خدمت سرانجام دیتی ہے جو بعض اوقات شہر کی چار دیواری میں میونسپلٹی کے کارکنوں کو سرانجام دینا پڑتی ہے۔ میری مراد صفائی سے ہے۔ مگر فطرت کے پیشِ نظر زمین کی وسیع مملکت ہی ایک شہر ہے اور اس کی میونسپلٹی کے کارکنوں میں آندھی کو ایک مقامِ امتیاز حاصل ہے۔ دراصل آندھی فطرت کی جاروب کش ہے۔ اور اس کا کام تیزی اور پھرتی سے کوہ و صحرا، شہر و دیہات اور باغ و راغ کو ہر طرح کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کرنا ہے۔ ہمارے شہروں کے میونسپل کمشنروں کو آندھی کے طریق کار سے سبق لینا چاہئے کہ یہ محض خاص خاص سڑکوں تک ہی اپنی مساعی کو محدود نہیں رکھتی بلکہ کونوں کھدروں تک پہنچتی ہے۔ اور ہر شے کو جھاڑ پونچھ کر تازہ دم کر دیتی ہے۔ شاخوں سے زرد پتے گر جاتے ہیں۔ بیمار اور کمزور ٹہنیوں کی کاٹ چھانٹ ہو جاتی ہے، کمزور اور ناتواں مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ اور بجلی کے ناقص کھمبے سربسجود ہونے لگتے ہیں۔ آندھی کی برکتیں ان گنت ہیں۔ آندھی کے تھپیڑے تصنع اور فریب کے سارے پردوں کو چاک کرتے اور ہر شے کی اصلیت کو ننگا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سبک سارانِ ساحل کو شاید یہ بات پسند نہ آئے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہینِ منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی، اُس کی حالت قابلِ رحم اور اس کی ذہنی پختگی محلِ نظر ہے۔

ریلوے ٹائم ٹیبل

میرے دوست ن کو مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ وہ اکثر کتابوں کے بارے میں مجھ سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے رہتے ہیں۔ اِدھر میرا یہ حال ہے کہ کتاب کے ذکر سے کوسوں دُور بھاگتا ہوں لیکن کیا کروں، مجبور ہوں! دوستی میں ہر طرح کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ پھر بھی بعض اوقات طبیعتوں کا تصادم رُونما ہو ہی جاتا ہے۔ مثلاً پرسوں کی بات ہے۔ مجھ سے کہنے لگے آپ نے جو کتابیں پڑھی ہیں اِن میں سے دلچسپ ترین کتاب کا نام لیں ——— ایسی کتاب جس نے آپ کو رُوحانی طور پر اوپر اُٹھایا ہو، آپ کے احساسات کو اپنی گرفت میں لاکر آپ کو دنیا و مافیہا سے اس درجہ بے نیاز کر دیا ہو کہ ——— میں نے فقرے کے ختم ہونے کا انتظار کئے بغیر عرض کیا کہ مجھ ایسے اُجڈ دیہاتی کی نظروں میں تو سب کتابیں ایک جیسی ہیں، پھر بھی ایک کتاب نے مجھے بطورِ خاص متاثر کیا ہے اور اس میں میری دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی ایڈیشن چھپا ہو، جسے خریدنے کا فخر مجھے حاصل نہ ہوا ہو۔ میرے دوست کہ کتابوں کا انھیں بے حد شوق ہے، یکایک اپنی جگہ سے اُچھل پڑے اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہنے لگے ——— "دکھائیں! دکھائیں! مجھے وہ کتاب دکھائیں۔ ایسی کون سی کتاب ہو سکتی ہے؟" میں نے

بہتیرا کہا کہ کبھی دیکھ لینا۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ لیکن وہ اِس قدر مُصر ہوئے کہ میں مزید انکار کر ہی نہ سکا۔ چنانچہ میں انھیں اپنی اس الماری کے پاس لے گیا جس میں میرا کل اثاثہ بند پڑا ہے۔ دفتر کے فائل، قلم دان، دو تین پیپر ویٹ اور گتّے کے چند ٹکڑے تو اوپر والے خانے پر قابض ہیں۔ درمیانی خانے میں کچھ پلیٹیں، آگ جلانے کا سٹوو اور کچے ٹماٹروں کی ایک رکابی پڑی ہے۔ اور پھر وہ نچلا خانہ جس میں ایک ہی وضع کی دو درجن کتابیں بڑی ترتیب اور سلیقے سے ایک دوسری کو سہارا دئے کھڑی ہیں۔ میرے دوست لپک کر اس تیسرے خانے کی طرف بڑھے۔ اور پہلے ہی حملہ میں کتاب کی کئی جلدیں نکال کر لے آئے۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انھوں نے اِن جلدوں پر نگاہ دوڑائی، ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی، ایک نظر پھر ان جلدوں کی طرف دیکھا اور تب انتہائی مریل آواز میں کہنے لگے ——— "یہ تو ریلوے ٹائم ٹیبل ہیں"۔ میں نے عرض کیا: "۱۹۳۵ء کے بعد کا ہر ایڈیشن میرے پاس موجود ہے"۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں آیا۔ خاموشی، گہری خاموشی! سنّاٹا، گہرا سنّاٹا! پھر قدموں کی چاپ، دروازہ کھُلنے اور پٹ کے دہلیز کے ساتھ زور سے ٹکرانے کی آواز۔ اس کے بعد جو خاموشی مسلّط ہوئی وہ میرے اور ان کے درمیان آج تک قائم ہے۔

ممکن ہے آپ میرے دوست کے ردِّ عمل کو حق بجانب قرار دیں اور ریلوے ٹائم ٹیبل سے میری جذباتی وابستگی کو محض ایک نفسیاتی عارضہ کہہ کر مسترد کر دیں۔ خدانخواستہ اگر آپ اس غلطی کے مرتکب ہوئے تو میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکوں گا کہ خود آپ نے کبھی ریلوے ٹائم ٹیبل کا بطور کتاب مطالعہ نہیں کیا۔ ممکن ہے آپ کو کبھی ریلوے ٹائم ٹیبل سے مستفید ہونے کی نوبت ہی نہ آئی ہو اور آپ نے ریل کی آمد و رفت کے اوقات ریلوے قلی سے دریافت کر لینے پر ہی اکتفا کیا ہو یا شاید آپ نے ایک شدید افراتفری اور ذہنی انتشار کے عالم میں ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرف رجوع کیا ہو جب کہ آپ کی تمام تر توجّہ منزل پر مرکوز تھی یا آپ سفر کی دوسری تیاریوں میں الجھے ہوئے تھے ——— میرا معاملہ اس سے قدرے جداگانہ نوعیّت کا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ میں ریل میں شاید ہی کبھی سفر کرتا ہوں، میرے حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد نہیں

کہ میں نے کبھی کسی خاص سفر کے پیشِ نظر ریلوے ٹائم ٹیبل سے رجوع کیا ہو۔ اس کے باوجود جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا، میرے نزدیک ریلوے ٹائم ٹیبل سب سے دلچسپ کتاب ہے اور میں نے ہمیشہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے ہر ایڈیشن کا خیر مقدم کیا ہے۔ کیوں؟ میں عرض کرتا ہوں کہ کیوں؟

کہتے ہیں سفر سے مفر نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسانی فطرت قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس میں شعلے کی سی بے قراری اور ہوا کی سی آوارہ خرامی ہے اور یہ زیادہ دیر تک ایک سی صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید اس کے علاوہ سفر کی طرف انسان کے مائل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد تہذیب، قانون اور گھر کے بندھنوں کو قبول کرنے سے پہلے مکمل طور پر آزاد تھے۔ آج یہاں، کل وہاں، گھر اور وطن کی حدود سے بے نیاز، پھر تہذیب کا آغاز ہوا۔ زمین سے وابستگی پیدا ہوئی، فصلیں اُگائی جانے لگیں۔ پھر گاؤں آباد ہوئے۔ خاندان اور قبیلے کا سلسلہ قائم ہوا۔ پھر شہر عالمِ وجود میں آئے۔ قوم اور وطن کے تصوّرات نے جنم لیا۔ اور انسان خود ساختہ زندان میں اس بُری طرح قید ہوا کہ اپنی فطرت کے اوّلین تقاضے کو ہی فراموش کر بیٹھا۔ لیکن کبھی فطرت کا اٹل تقاضا بھی مصنوعی حد بندیوں سے پابہ زنجیر کیا جا سکا ہے؟ کبھی دریا کا بہاؤ، ہوا کی آوارہ خرامی کو بھی روکا جا سکا ہے کبھی ——— ؟ مطلب یہ کہ سفر کا اقدام انسانی فطرت کا ایک ضروری تقاضا ہے اور اس کی تندی کے سامنے بڑے سے بڑا پوستی بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ جو رنگین بوشرٹوں والے نوجوان، کیمرے اور تھرمس لٹکائے، دشوار گزار راستوں پر مارے مارے پھرتے ہیں یا ریل کی کھڑکی سے لگے، ناقابلِ بیان صعوبتوں کو برداشت کرتے گزرتے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے ہیں ——— یہ لوگ دراصل اپنی فطرت کے اس اوّلین تقاضے ہی کے رحم و کرم پر ہیں اور ان کی حالت بے بس قیدیوں سے کسی طور بھی بہتر نہیں۔ جدید علم النفس ایسے لوگوں کو سخت شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جدید علم النفس کی گھورنے والی آنکھ سے بچنے کے لئے، نیز سفر کی صعوبتوں، نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ

سے محفوظ رہنے کے لئے میں یہ کرتا ہوں کہ اپنی فطرت کے اس نہایت جائز اور مستحسن تقاضے کی تسکین کے لئے ریلوے سٹیشن کی بجائے اپنے کمرے کا رُخ کرتا ہوں۔ چارپائی کو پنکھے کے نیچے کر لیتا ہوں اور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتا ہوں۔ پھر میں تکیے کے نیچے سے ریلوے ٹائم ٹیبل نکالتا ہوں، سگریٹ سلگاتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ایک لمبے سفر پر روانہ ہو جاتا ہوں۔ باہر لُو چل رہی ہوتی ہے۔ جس سے دروازے کے پٹ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھُلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی موٹا سا چوہا دہلیز کے سُوراخ میں سے جھانکتا ہے اور مجھے مطالعہ میں مصروف پا کر کمرے میں آزادانہ پھرنے لگتا ہے۔ لیکن میں کمرے میں کب ہوتا ہوں کہ چوہے کو اس کی جرأت کا مزا چکھاؤں۔ اس وقت تو میں چھوٹی لائن کی کسی ریل گاڑی میں بیٹھا اُڑا چلا جا رہا ہوں۔ ٹھہریئے میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔ یہ لکی مروت جنکشن ہے۔ لائن چھوٹی ہے۔ کیونکہ دشوار گزار پہاڑی راستے بڑی پٹڑی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چھوٹا سا انجن بالکل جیسے بچوں کا کھلونا۔ اس کے پیچھے ننھے ننھے دس بارہ ریل کے ڈبے، یقین نہیں آتا کہ ان میں گڑیوں کے علاوہ کوئی اور شے بھی سما سکتی ہے۔ لیکن میں ایک کونے میں سہما سمٹا بیٹھا ہوں اور چوڑے سینے والے خوفناک پٹھانوں کو نسوار کی چٹکیاں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں میں سے مجھے گھورتے ہیں جیسے اگلے ہی اسٹیشن پر مجھے ذبح کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ گاڑی چل پڑی ہے۔ یہ شہباز خیل کا اسٹیشن ہے۔ اس کے بعد پیزو، گل امام اور پھر ٹانک! یہاں ریل ختم ہو جاتی ہے۔

اب میدان میں سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پہاڑی سفر سے اکتا گیا ہوں۔ جی ہاں! حدِ نظر تک پھیلے ہوئے میدان ہوں جن میں ایک موٹا سا ہیبت ناک انجن، چند نازک اندام ریل گاڑیوں کو اپنے پلّو سے باندھے چیونٹی کی چال بڑھتا چلا جائے۔ اس طور کہ اسے ہر قدم پر منزل کا گمان ہو۔ یہ پڈیدن جنکشن ہے۔ گھبرائیے نہیں! پاکستان ریلوے ہی کی بات کر رہا ہوں گاڑی چل پڑی ہے۔ کھڑکی سے باہر جلا جھلسا ہوا منظر ہے۔ سارے کھیت جل چکے ہیں اور سارے مکان مسمار ہو گئے ہیں۔ دراصل اس علاقے کی اہمیت ان لوگوں کے باعث نہیں جو

ابھی زندہ ہیں بلکہ ان لوگوں کی وجہ سے ہے جن کی خاک بھی اب لحد میں باقی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر قرن ہا قرن کی موٹی موٹی تہیں جم چکی ہیں اور جن کی شان میں لوگ باگ اب طول طویل نظمیں لکھ کر زندہ جاوید ہو جانے کی سعی کرتے ہیں۔ کلھوڑا اسٹیشن پر گاڑی رکی ہے ——— نوشہرو فیروز، ٹھاروشاہ، تھٹ ہاٹ چند، دولت پور سافان، سیکھومانا ہیجو اور اس کے بعد سابورا ہو، بارو جو باغ، ہالا اور ملّا ماخان ——— یہ سب بحرالکاہل کے جزیروں کے نام نہیں بلکہ ان ننھے منے اسٹیشنوں کے نام ہیں جن پر پاکستان ریلوے کا یہ معمّر انجن سانس لینے کے لئے رکتا ہے اور جہاں ہوا کے دوش پر ریت کے ٹیلے اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

گرمی بڑھ گئی ہے۔ میں اٹھ کر پنکھے کی رفتار تیز کر دیتا ہوں۔ موٹا چوہا لپک کر دہلیز کے سوراخ میں غائب ہو جاتا ہے اور پھر ایک لمحے کے بعد اس کی لمبی لمبی مونچھیں سوراخ میں سے نکلی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں ——— اب یہ ایک گمنام سی گاڑی ہے جو واقعتاً کسی گمنام سی منزل کو رواں ہے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں یہ برانچ لائن ہر کس و ناکس کو نظر نہیں آ سکتی۔ صرف مجھ ایسا ماہر ہی اس تک رسائی پا سکتا ہے۔ یہ لائن کسی سیمنٹ، لوہے یا نمک کی کان کی طرف جاتی ہے۔ آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کی آخری منزل کون سی ہے۔ انجن اور گارڈ روم کے علاوہ اس گاڑی میں بیشتر مال کے ڈبے ہیں۔ سواریوں کے لئے صرف ایک ڈبا ہے اس ڈبے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہیں۔ گویا ساری گاڑی میں صرف تین آدمی گرمِ سفر ہیں ——— انجن ڈرائیور، ریلوے گارڈ اور میں! عجیب سی تنہائی ہے۔ گویا ازل اور ابد کے درمیان میں اکیلا ہی چلا جا رہا ہوں۔ گارڈ اور انجن ڈرائیور تو محض دو فرشتے ہیں جو میرے نامۂ اعمال کو سیاہ کرنے کے لئے میرے شانوں پر سوار ہیں۔ لیکن یہ کیا؟ اس لق و دق صحرا میں گاڑی کیوں رُک گئی ہے۔ میں کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا انتظار کرتا ہوں۔ ہوا کی سسکیوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں۔ انجن کی آواز بھی بند ہے۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ میں کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں، آسمان پر ایک ملگجی سی دُھند

چھائی ہوئی ہے اور میدان تانبے کی طرح تپ رہا ہے۔ میں گارڈ کو آواز دیتا ہوں — گیند کی آواز میرا منہ چڑاتی ہے۔ میں گاڑی سے اتر کر انجن کی طرف بڑھتا ہوں۔ کچھ دُور جانے کے بعد ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دیتی ہے۔ اور پھر میں حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ اس ندی میں انجن ڈرائیور اور ریلوے گارڈ کپڑے اتارے نہا رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر ایک نعرہ مستانہ لگاتا ہوں اور کپڑوں سمیت ندی میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔

باہر روشنی کچھ ماند پڑ رہی ہے۔ میں اُٹھ کر کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ واقعی شام ہونے کو ہے۔ لمبی لمبی مونچھوں والا چوہا بھی غائب ہے۔ اب مجھے پنکھا بند کر دینا چاہیئے میں ریلوے ٹائم ٹیبل کو بڑی حسرت سے دیکھتا ہوں اور ان برانچ لائنوں اور نیرو گاج لائنوں کا تصوّر کرتا ہوں جن پر میں آج سفر نہ کر سکا۔ خیر کل سہی! یار زندہ صحبت باقی!۔ میں اپنی عزیز ترین متاع یعنی ریلوے ٹائم ٹیبل کو اٹھا کر الماری میں بند کر دیتا ہوں اور پھر تولیا صابن ہاتھ میں لئے ہوئے گنگناتا غسل خانے میں داخل ہو جاتا ہوں۔

بے ترتیبی

میرے مُلازم کی یہ ایک نہایت بُری عادت ہے کہ جیسے ہی میں کہیں باہر جاتا ہوں وہ بے جھجک میرے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور آناً فاناً میرے پھیلائے ہوئے انتشار کو ترتیب اور سلجھاؤ میں بدل دیتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ بھلے آدمی! یہ کوئی قبرستان تو ہے نہیں کہ قبروں کی طرح میزیں، کرسیاں اور کتابیں بھی ایک خاص ترتیب میں قطار اندر قطار نظر آئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ وہ پہلے تو حیران ہو کر میری طرف دیکھتا ہے، پھر مسکراتا ہے۔ جب میں جواباً مسکرانے کی کوشش نہیں کرتا تو چپکے سے کھسک جاتا ہے۔ اگلی بار پھر وہی حرکت۔ سچ! میں تو تنگ آ گیا ہوں۔

آپ شاید کہیں کہ اگر ملازم حسبِ منشا نہیں تو اسے بدل دیجئے۔ بہت بہت شکریہ! بات دراصل یہ ہے کہ ملازم بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو قوم کی قوم ہی اس مرض میں مبتلا ہے۔ شاید چونکہ ان کی اپنی زندگی میں ترتیب اور توازن کا فقدان ہوتا ہے اس لئے وہ آپ کے کمرے کو اپنی نارسا آرزوؤں کی تسکین کے لئے تختۂ مشق بناتے ہیں یا پھر ممکن ہے وہ مالکوں کی قوم سے انتقام لینے کے لئے ایسی حرکات کے مرتکب

LIBRARY
MALHOTRA COLLECTION

ہوتے ہوں۔ ہزاروں باتیں ہو سکتی ہیں۔ میرے ایک "ماہر نفسیات" دوست کا کہنا ہے کہ ملازمین کی یہ حرکت محض ایک "خندۂ استہزا" ہے اور اس سے انھیں مالک کے مقابلے میں احساسِ برتری حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم! نفسیاتی تحقیقات کے اس زمانے میں جو کچھ بھی ہو کم ہے۔

بہرحال، جیسا کہ میں نے کہا۔ میں اپنے ملازم کی اس حرکت سے سخت پریشان ہوں — مجھے دراصل ترتیب سے وحشت ہوتی ہے۔ توازن اور سلجھاؤ سے میرا دم رُکنے لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوں اور اپنے ہی عائد کئے ہوئے ضوابط میں اسیر۔ میرے لئے سخت ترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک سجا سجایا کمرہ میرا خیر مقدم کرتا ہے۔ ہر چیز قرینے سے دھری گویا صدیوں سے اسی طرح پڑی ہے، میزیں، کرسیاں، کتابیں، قالین اور پردے —— ہر چیز ایک غیر فانی ترتیب میں ڈوبی ہوئی کسی صوفیانہ استغراق میں گم، زمان و مکان کی سرحد کو عبور کر چکی ہے۔ مجھے کمرے میں آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اگر کسی شے کو ہاتھ لگایا تو دفعتاً اس الف لیلوی ماحول کے کسی معطر پردے سے کوئی چمکتا ہوا خنجر برآمد ہوگا اور میرے سینے میں پیوست ہو جائے گا یا جیسے میرے داخل ہوتے ہی پردۂ غیب سے تحکّم آمیز لہجے میں "خبردار" کا نعرہ بلند ہوگا اور میں پتّھر کے بُت میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ یہ ترتیب، یہ سلجھاؤ، یہ تغیّر ناآشنا کیفیت، موت کے سے انجماد کا نقشہ پیش کرتی ہے اور میرے اپنے احساسات بھی پابہ زنجیر ہونے لگتے ہیں۔ میں خود بھی کمرے کا ایک حقیر سا بے روح جزو ہو کر رہ جاتا ہوں —— اس کے برعکس جب میں کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھتا ہوں کہ کرسیوں، میزوں، فرش اور آتش دان پر کتابیں، رسالے اور اخبارات آوارہ بچوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ ایک کرسی سربسجود ہے اور دوسری میز سے مصروفِ گفتگو۔ صوفے کا پردہ لٹک کر فرش کے قالین سے دست و گریباں ہے اور قالین کے شیر نوکِ پا کی زد میں ہیں —— آتش دان میں بجھے ہوئے کوئلے صحبتِ شب کے فراق میں مُہر بہ لب ہیں۔ اور سگریٹ کے ٹکڑے

اور کیلے کے چھلکے میز کے حُسن میں اضافے کا موجب بن رہے ہیں —— تو یکایک مجھے محسوس ہوتا ہے گویا ایک طویل مدت کے بعد اپنے کسی قریبی دوست سے ملا ہوں اور دوست نے دل کے دروازے کھول کر انتہائی خلوص اور محبّت سے میرا خیر مقدم کیا ہے۔ بے ترتیبی میں محبّت ہے، لچک ہے اور رفاقت۔ ترتیب میں تصنّع، انجماد اور بے رخی ہے۔ بے ترتیبی سے شخصیت نمو پاتی، پھلتی پھولتی، سبک اور تازہ دم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترتیب کی گرانبار کیفیت شخصیت کو منجمد کر دیتی ہے۔ محبّت اور رفاقت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ پھیلنے اور بڑھنے کے امکانات کو ختم کر دیتی ہے۔ ترتیب کے دائرے میں داخل ہوتے ہی اشیا، کیفیات اور شخصیتیں اپنی مخصوص انفرادیت سے دست کش ہو جاتی ہے اور ان کا سراپا اور وجود ایک مشین کی طرح کسی دوسرے کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ میدانِ جنگ کی طرف "مارچ" کرتی ہوئی باترتیب فوج اور باغ میں چہل قدمی کرتی ہوئی خوش باش مخلوق میں جو فرق ہے، ترتیب اور بے ترتیبی کی لکیروں سے بڑی اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ فوجی جوان ایک مشینی استغراق میں گم، ایک ادنیٰ حکم پر بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن باغ میں سیر کرتا ہوا ہر شخص اپنی دُنیا آپ ہے، وہ خود محشرِ خیال ہے اور اپنی حرکات و سکنات اپنے انداز و اطوار کے لئے بالکل آزاد ہے۔ اسے آپ بے مطلب روشوں پر گھومتا ہوا بھی دیکھ سکتے ہیں اور سڑک کنارے کباب والے کے خوانچے سے ناشتہ کرتے ہوئے بھی پا سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو اُسے کسی خاموش سے گوشے میں بآوازِ بلند خود سے گفتگو کرتے ہوئے بھی پکڑ سکتے ہیں۔ بے ترتیبی زندگی کی مظہر ہے۔ اس میں ایک بہاؤ، ایک رواں دواں کیفیت، گرم گرم لہو کی سی بے قراری اور ہر لحظہ تبدیل ہونے اور نئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہے۔ لیکن ترتیب میں ایک سنگلاخی کیفیت ہے۔ ترتیب تو اُس سوکھی شاخ کی طرح ہے جسے ذرا سا جھکائیں تو تڑاخ سے ٹوٹ جائے۔ اس میں نمی، لچک اور زندگی تو ہوتی نہیں۔

ترتیب میں ایک اور نقص یہ ہے کہ اس کے تحت آپ ضرورت سے زیادہ چاق و چوبند ہو جاتے ہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے

ہزاروں بار دائیں بائیں آگے پیچھے نظر دوڑاتے ہیں۔ آپ کا ہر عمل بُردباری، فراست، تہذیب اور توازن سے مملو ہو جاتا ہے اور آپ کی شخصیت کی باگ ڈور خرد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ یہ کوئی قابلِ مبارک بادبات نہیں۔ کیونکہ اس سے آپ کے آگے بڑھنے، ترقی پذیر ہونے اور پھلنے پھولنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ عقل کی تگ و دو تو ہمیشہ سے لبِ بام تک ہی رہی ہے۔ یہ آپ کو سبکسارانِ ساحل کی انجمن کا مستقل رکن بنا دیتی ہے اور زیادہ مہربان ہو تو اس انجمن کا اعزازی عہدہ بھی دے دیتی ہے اور آپ تالاب کے مکین کی طرح اپنی مختصر سی دُنیا میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بے ترتیبی کا ہر عمل قید سے آزاد ہونے کا اقدام ہے۔ بے ترتیبی کی آوارہ خرامی ایک اجتہادی عمل ہے ——— ایک ایسا اجتہادی عمل، جس کے بغیر زندگی کا ارتقا ممکن ہی نہیں۔ ہزاروں باشعور، مہذّب، مرنجاں مرنج، باترتیب انسانوں سے جو نہیں ہو سکتا۔ وہ اکثر ایک آوارہ، جنونی، غیر مہذّب انسان کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ترتیب عقل و خرد کی غمّاز ہے بے ترتیبی جذبے کی علَم بردار ہے اور روسو کی تقلید میں میرا اپنا ووٹ جذبے کے حق میں ہے۔

بے ترتیبی میں ایک ملکوتی حُسن ہے۔ ایک اُچھلتے کودتے، ہنستے ناچتے اور اور شرارتیں کرتے ہوئے بچے میں جو کشش ہے وہ ایک متین، مہذّب چبا چبا کر طوطے کی طرح رٹی رٹائی باتیں کرنے والے بچے میں کہاں؟ ایک اَلھڑ سی غیر مہذّب دیہاتی نازنین میں جو زندگی، جاذبیت اور نکھار ہے۔ وہ خود ساختہ آرائش کی محتاج، تہذیب اور تصنّع میں ڈوبی ہوئی دوشیزہ میں کہاں؟ بھلا حُسن بھی کبھی خطوں، لکیروں اور نقطوں کا منت کش ہوا ہے؟ ——— فطرت کا سارا حسن اُس کی بے ترتیبی میں ہے۔ سیدھے خط تو صرف انسان کھینچتا ہے اور بزعمِ خود سمجھتا ہے کہ اُس نے کوئی بڑا تیر مار لیا ہے۔ انسان کے اُگائے ہوئے باغوں اور ترتیب دئے ہوئے پارکوں کا سارا حسن قاعدے اور اصول کا رہینِ منت ہے لیکن فطرت کا حُسن تو ان باتوں کا محتاج نہیں جو پاگل کر دینے والی خوبصورتی، جو نشیلی کیفیت ایک خودرو جنگل

میں ہے، ایک صاف ستھرے بنے ٹھنے ہوئے باغیچے میں کہاں؟ لیکن جنگل ترتیب کا محتاج نہیں۔ اس کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی میں ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے، دریاؤں کے پیچ و خم، سمندر کے کٹے پھٹے کنارے اور آسمان کے نیلگوں فرش پر بڑی بے پروائی سے بکھیرے ہوئے انگنت ستارے ـــــ کوئی چیز بھی تو ترتیب کے حصار میں قید نہیں۔ انسان کی ساری عمر اشیا کو ترتیب دینے میں بیت جاتی ہے اور ہر بار فطرت کی لازوال بے ترتیبی کا عمل بڑھ کر اس ترتیب کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ترتیب خلافِ فطرت عمل ہے۔ یہ محض انسان کا ایک غیر صحت مند اقدام ہے ـــــ تہذیب کی گرینڈ ٹرنک روڈ، سماج کی دائرہ در دائرہ تنظیم، نقطۂ نظر کی سیدھی لکیر ـــــ یہ سب انسان نے اپنی سوچ بچار سے جنم دئے ہیں۔ فطرت سے اخذ نہیں کئے۔ اسی لئے ان میں ایک دم رو کنے والی کیفیت ہے جو احساس و جذبے کو شل کرتی اور فطری صلاحیتوں کو.....

معاف کیجئے گا! میں اپنے ملازم کا ذکر کر رہا تھا۔ دیکھئے اس بار اس نے میرے باہر جانے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اور کمرے کی نوک پلک سنوارنے کے لئے آدھمکا ہے۔ عجیب انسان ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ بھلے آدمی ـــــ!

کچھ علالت کی حمایت میں

پرسوں تک اس بات پر میرا کامل ایمان تھا کہ تندرستی نعمتِ عظمیٰ ہے۔ لیکن آج میرا خیال ہے کہ اُن تمام استادوں، ڈاکٹروں اور حفظانِ صحت کے ماہروں کو تہِ تیغ کردوں جنھوں نے مجھے ایک غلط روش پر گامزن ہونے کی ترغیب دی اور مجھے اُس انوکھی مسرّت سے محروم رکھا جو صرف بسترِ علالت پر ہی کسی کو نصیب ہو سکتی ہے اور جسے بلاشبہ ان لوگوں نے صرف اپنی میراث سمجھا ہے۔ ان لوگوں سے تو خیر مروت کی توقع بھی کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ خود سے مجھے یہ گلہ ضرور ہے کہ اپنی ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کے باعث میں نے ایسے کتنے ہی شاندار موقعے گنوا دیئے جب میں بڑی آسانی سے بسترِ علالت پر دراز ہو سکتا تھا۔

بہرکیف طویل سوچ بچار اور دماغ سوزی کے بعد میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علالت سے فرار حاصل کرنے کا رجحان زمانہ سائنس کی پیداوار ہے، یعنی جس دن سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ بیماری اللہ میاں کی طرف سے نازل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اُس جرثومے کی کارستانی ہے جو کسی نہ کسی طرح ہمارے جسمانی نظام کو میدانِ کارزار میں تبدیل کر دیتا ہے، اسی دن سے انسان علالت کے اعصابی خوف میں مبتلا

ہو گیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں ہر بیماری یا تو قدرت کی طرف سے چیلنج تھا جسے انسان کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا یا پھر ایک امتحان تھا جس میں اللہ میاں گاہے گاہے اپنے پیاروں کو مبتلا کر دیا کرتے تھے۔ بہر صورت اس ساری کشمکش کا ایک روحانی پس منظر قائم رہتا اور اس کشمکش سے بخیر و خوبی گزر آنے کے بعد مریض کو ایک روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں اگلے زمانے کی ہیں۔ سائنس نے ان سب پر پانی پھیر دیا ہے۔ اب اول تو بیمار ہونا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے طرح طرح کے خوف دلا کر نفسیاتی الجھنوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے پھر طرفہ تماشا یہ کہ مریض کو علالت کے اُس روشن پہلو سے قطعاً ناآشنا رکھا جاتا ہے، جس کا انکشاف مجھ پر اب ہوا ہے اور جسے آپ تک پہنچاتے ہوئے میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ بھی جلد از جلد اپنے اپنے بستر ہائے علالت کی طرف رجوع کریں گے۔

قصہ یہ ہے کہ پرسوں شام مجھ پر یکایک کپکپی سی طاری ہوئی، پھر مجھے یوں لگا جیسے میں قطب شمالی پر کھڑا زمین کو اپنے محور پر گھومتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ایک لحاف، دو کمبل اور چٹختے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی بھی جسم و روح کی کپکپاہٹ کو فرو نہ کر سکی اور میں اردو شاعری کے روایتی عاشق کی طرح عشق کی پہلی منزل پر ہی لڑکھڑانے لگا۔ لیکن پھر یکایک جسم کی پہنائیوں سے حرارت کی ایک تُند و تیز لہر اٹھی اور میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے جہنم زار میں سرگرداں پایا جہاں شعلے، سُرخ سُرخ زبانیں نکالے افریقہ کے بونوں کی طرح میرے گرد ناچ رہے تھے ——— نہ جانے حرارت کی لہریں کتنی بار اور کتنی دیر تک مجھ سے ٹکراتی رہیں؛ البتہ جب میں ہوش میں آیا تو رات بیت چکی تھی۔ بخار اتر گیا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ہر شے روشن اور دُھلی دُھلی نظر آ رہی تھی۔ بستر کے قریب ایک چھوٹی سی تپائی پر دوا کی چند شیشیاں پڑی تھیں ——— سُرخ اور پیلی اور سفید ——— گویا قوسِ قزح میز پر اتر آئی تھی۔ تپائی کے اوپر کھلی ہوئی کھڑکی میں سے گہرا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ جہاں بادلوں کے آوارہ ٹکڑے سنہری بجروں کی طرح رواں

دواں تھے۔ دور تک کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا ـــــ اور ادھر انگور کی ایک بیل کھڑکی کے باہر سے جھک جھک کر کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس بیل پر چند چڑیاں دھیمے سُروں میں گا رہی تھیں ـــــ ساری فضا میں رخشندگی، طراوت، نُور اور پاکیزگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ جسم کے ساتھ ساتھ میری روح بھی کھل اٹھی تھی گویا کسی پُراسرار طاقت نے مجھے آتشین بھٹی سے گزار کر کندن کر دیا ہو۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میرے سارے دلخراش احساسات اور بوجھل خیالات جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ اور میں نے اپنے کاندھے جھٹک کر اس راکھ کو فضا میں بکھیر دیا ہے۔ اب میں نسیمِ آوارہ کے اس جھونکے کی طرح سُبک اور تازہ دم تھا، جسے چمن کی خوشبو نے ابھی سرگراں اور بوجھل نہ کیا ہو۔

لیکن یہ ساری بات کل کی ہے۔ اور اگرچہ میں ابھی تک بسترِ علالت پر دراز ہوں تاہم کل سے لے کر آج تک میں نے علالت کے بہت سے دلفریب پہلوؤں کی جھلکیاں دیکھ لی ہیں اور مجھ پر لمحہ بہ لمحہ علالت کی خوبیاں واضح ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

بسترِ علالت نے پہلا کرم تو مجھ پر یہ کیا ہے کہ مجھے ایک نیا زاویۂ نظر عطا کیا ہے۔ پرسوں تک مجھے محسوس ہوتا تھا گویا میں زندگی کے سیلِ رواں کی ایک ایسی موج ہوں جس کی اپنی ہستی محض دوسری موجوں کی کروٹ کا نتیجہ ہو یا جیسے میں ایک ایسی گیند ہوں جسے انجانی پُراسرار قوتوں نے سطحِ زمین پر لڑھکا دیا ہے اور میری حرکات و سکنات محض زمین کے نشیب و فراز کے رحم و کرم پر ہیں۔ لیکن آج یہ اندازِ نظر باقی نہیں۔ آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا بستر ایک جزیرہ ہے اور میں اس جزیرے میں سے اس بپھرے ہوئے سمندری طوفان کو دیکھ رہا ہوں جس سے کچھ روز پیشتر میں خود بھی نبرد آزما تھا ـــــ پھر نرم بستر پر دراز مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں ایک ٹیلے پر چند لحظوں کے لئے بے حس و حرکت ہو گیا ہوں اور بڑے اطمینان سے اپنے ان عزیزوں، دوستوں، بچوں اور ہمسایوں کو دیکھ رہا ہوں جو لڑھکتے ہوئے گیندوں کی طرح آتے ہیں۔ اور میرے بستر کے گرد ایک چکر سا لگا کر لڑھکتے لڑھکتے واپس چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کلبلاتی ہوئی مخلوق سے بہت دور

——— بستر کی نرم اور پُرسکون فضا میں مجھے اُس تماشائی کا منصب ملا ہے جس کے سامنے شب و روز ایک تماشا ہو رہا ہو اور وہ اسے بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہ دے۔

بسترِ علالت کے طفیل میں نے اپنے ماحول کو ہی از سرِ نو نہیں دیکھا بلکہ زندگی کو بھی ایک بالکل نئے رُوپ میں پایا ہے۔ اس علالت کے دوران میں مجھ پر اچانک یہ انکشاف ہوا ہے کہ زندگی اُس تیز گام مسافر کی طرح ہے جو لامحدود خلا کی شاہراہ پر بڑھتا چلا جا رہا ہو اور وقت اس پہیّے کی طرح ہے جو ایک مخصوص رفتار سے اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ میں وہ مسافر تھا جو وقت کے پہیّے سے بے نیاز اُچھلتا کودتا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ علالت نے میری رفتار میں ایک دھیما پن پیدا کر دیا اور خلا کی شاہ راہ پر میرے قدموں کی چاپ مدّھم ہونے لگی۔ اچانک مجھے ایک گڑگڑاہٹ سی سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے وقت کا وہ پہیّہ دکھائی دیا جو ہولے ہولے لیکن یقینی طور پر میرے تعاقب میں بڑھا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ ٹکر کا کوئی دلفریب منظر دکھائی دیتا، میری رفتار تیز ہونے لگی اور میں اپنے حریف سے بہت جلد آگے نکل گیا ——— ایک روسی ادیب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی تھی اور عین جس وقت پھانسی کا تختہ اس کے پاؤں تلے سے ہٹایا جانے لگا تھا، اس کی جان بخشی کا حکم آ گیا تھا لیکن اس ادیب نے موت کی خونی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ بقیہ زندگی یہ خونی آنکھیں ایک سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اور وہ کبھی ان کی ابدی رفاقت سے نجات نہ پا سکا ——— لیکن میرا مُعاملہ جُدا ہے۔ ایک بڑا فرق تو یہ ہے کہ روسی ادیب کے نیچے پھانسی کا تختہ تھا اور میں ایک بستر پہ دراز ہوں اور بستر اور تختے میں بہرحال کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ دوسرا یہ کہ روسی ادیب پر تو موت کا خوف مسلّط ہو گیا تھا، لیکن مجھے وہ لذّت نصیب ہوئی ہے جو خطرے کے بہت قریب ہونے اور پھر خطرے کے ٹل جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اب پہلی سی بے نیازی کے ساتھ وقت کی شاہراہ پر نہیں چل سکوں گا؛

کیونکہ میں نے وقت کے پہیّے کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ تاہم اس لمحاتی فتح نے مجھ میں ایک انوکھی سربلندی کا احساس ضرور پیدا کر دیا ہے اور وقت کی بے رحم رفتار کے پیشِ نظر میں زندگی کی قدر و قیمت کا کچھ اور بھی قائل ہو گیا ہوں۔

زندگی آپ کو رعنائیوں اور دلفریبیوں کے سحرِ عظیم میں اس طور جکڑ لیتی ہے کہ آپ ایک الف لیلوی انسان کی طرح جادو کی اس پگڈنڈی پر بڑھتے چلے جاتے ہیں اور موت آپ کو ان اہرامی تاریکیوں میں اتار لے جاتی ہے۔ جہاں ہر احساس منجمد اور ہر جذبہ فنا ہو جاتا ہے لیکن یہ بسترِ علالت کا کرشمہ ہے کہ آپ کو زندگی اور موت کی سرحد پر چہل قدمی کرنے کی فرصت نصیب ہوتی ہے۔ اس سرحد کے ایک طرف تو مہیب اور تاریک غار ہیں۔ اور دوسری طرف حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب مرغزار! آپ کے ہونٹوں پر تبسّم ناچتا ہے۔ لیکن دل میں ایک خطرہ پھڑکتا رہتا ہے۔ خطرے کا قُرب آپ کے احساسات میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور آپ زندگی کی رعنائیوں کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں اب اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ علالت کے بعد انسان از سرِ نو اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ علالت سے پہلے زندگی میں بے نیازی، سطحیت اور کھلنڈرا پن تھا، لیکن علالت کے بعد آپ کے احساسات میں گہرائی اور خیالات میں عمق پیدا ہو جاتا ہے ——— زندگی اور موت کی اس سرحد پر ایک اور احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ یہ شاید ہر کسی کو حاصل نہ ہوتا ہو لیکن میرے حصّے میں ضرور آیا ہے۔ اس احساس کو میں پوری طرح لفظوں کی گرفت میں لینے سے قاصر ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ علالت کے دوران میں ایک ایسا نازک مقام بھی آتا ہے، جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ اب ایک لمحے میں کائنات کا سربستہ راز آپ پر منکشف ہو جائے گا۔ بس کوئی شے ہوتی ہے جو بڑی آہستگی سے بڑھ کر آپ کو دبوچ لیتی ہے ——— ایک ایسا مکمّل اور دلآویز نغمہ جو دبے پاؤں آتا ہے اور آپ کو اپنی لازوال لَے میں بہا لے جانا چاہتا ہے۔ اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ نغمہ ایک لمحہ اور قائم رہا تو آپ خود بھی اس نغمے کی ابدی لَے میں تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ لمحہ گزر جاتا ہے۔ آپ کروٹ

لے کر اپنی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ اور ڈاکٹر کی متفکر نگاہوں سے آپ کی نظریں پہلی بار ٹکراتی ہیں۔ وہاں ایک ہلکا سا اُمید افزا تبسّم جنم لیتا ہے اور آپ کو ایک نئی زندگی مل جاتی ہے۔ لیکن اس عظیم اور لازوال لمحے سے قربت کی یہ سعادت صرف بسترِ علالت پر ہی نصیب ہو سکتی ہے اور یہی علالت کا روشن ترین پہلو بھی ہے۔

ایسے ایسے سبز باغ دکھانے کے بعد کیا میں اب یہ اُمید کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں بسترِ علالت کی طرف رجوع فرمائیں گے۔ ضمناً یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ میں کوئی ڈاکٹر یا خاندانی حکیم نہیں ہوں، مجھے تو صرف خلقِ خدا کی بھلائی مقصود ہے۔

قُطب مینار

بزرگوں کا ارشاد تھا کہ دلّی جاؤ تو قُطب مینار ضرور دیکھو۔ اب کی بار میں دلّی گیا تو اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ قطب مینار دیکھے بغیر واپس نہیں آؤں گا۔ لیکن جب میں دلّی سٹیشن کی بلند و بالا عمارت سے نکل کر اُس شہر میں داخل ہوا، جو کبھی ایک عالم میں انتخاب تھا اور تانگوں، موٹروں، رکشاؤں اور پھٹ پھٹ رکشاؤں (اہلِ دلّی موٹر رکشا کو اسی طرح بولتے ہیں۔) کے سیلِ بے پناہ میں ڈوب گیا تو قطب مینار کا خیال ہی ذہن سے محو ہو گیا۔ آخری بار میں نے دلّی کو دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے مزاج میں ایک آشنا ضبط اور اس کی رفتار میں ایک مخصوص ٹھیراؤ تھا اور اس کے کوچہ و بازار میں اگلے وقتوں کے وہ لوگ بھی نظر آجاتے تھے، جنھیں کچھ کہنے کو جی چاہتا تھا۔ اور اب؟ لیکن اب تو دلّی شہد کا ایک چھتّہ ہے ——— چھتّہ، جسے کسی شریر لڑکے نے اپنی چھڑی سے چھیڑ دیا ہو اور چھتّے میں نہ صرف اضطراب کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہو، بلکہ خود سر مکھیاں اس میں سے نکل کر چاروں طرف دیوانہ وار اُڑنے لگی ہوں۔ یہ مکھیاں دلّی کے ہر بازار اور ہر سڑک پر پھٹ پھٹ رکشا کی صورت میں نظر آتی ہیں اور ان کی رفتار، سیمابی مزاج اور بے ہنگم شور نے دلّی کو صدیوں کی گہری نیند سے گویا جھنجھوڑ کر بیدار

کر دیا ہے۔

موٹر رکشا کے علاوہ آج کی دلّی کا دوسرا تحفہ وہ صندوق نما، بلند و بالا عمارت ہے جسے عرفِ عام میں کبوتر خانہ کہتے ہیں۔ دلّی کی ہر شاہراہ کے دونوں کناروں پر ایسے سینکڑوں کبوتر خانے گویا رات ہی رات میں زمین کے سینے کو چیر کر اُگ آئے ہیں۔ اہلِ نظر کی رائے میں یہ عمارت دلّی کے شاندار مستقبل کی ضامن اور اس کی مادی ترقی کا ایک ادنیٰ مظہر ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ عمارت اہلِ ہند کا وہ "بندی خانہ" ہے جس میں فرد کی ذاتی تگ و دو ایک سماجی شیرازہ بندی میں ضم ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے ان عظیم عمارات کو دیکھ کر لاہور کی وہ ننّھی ننّھی خوبصورت کوٹھیاں یاد آ گئیں جن میں سے ہر کوٹھی کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ اور جو فرد کے شخصی میلانات کی گویا غمّاز ہے۔ دلی کے فرد کو ایک کُلبلاتے ہوئے سماج نے اپنے اندر ضم کر لیا ہے لیکن لاہور میں ابھی تک فرد کا بول بالا ہے۔ یقین نہ آئے تو لاہور کا ایک چکّر لگا کر دیکھ لیجئے۔ ہم لوگ سماجی شیرازہ بندی سے کہیں زیادہ فرد کی بقا کے قائل ہیں ——— گھروں میں، دفتروں میں، وزارتوں میں ——— ہر جگہ فرد کا طوطی بول رہا ہے زندہ باد لاہور! پائندہ باد فرد!

میر و غالب کی دلّی مر چکی! اب اس کی خاک سے ایک نئی دلّی نے جنم لیا ہے۔ ماں میں ایک بزرگانہ وقار تھا اور وہ ضبط و تحمل، سکون و اطمینان کا گہوارہ تھی۔ بیٹی شان و شوکت غرور و تمکنت اور بناؤ سنگھار کی طرف مائل ہے۔ ماں کے پاؤں زمین پر تھے اور نظریں آسمان کی رفعتوں پر۔ بیٹی ساتویں منزل پر بصد ناز و ادا کھڑی ہے لیکن اس کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔

میں کوئی پندرہ برس کے بعد دلّی گیا تھا۔ اس کی یہ نئی شان دیکھی تو دنگ رہ گیا۔ کئی روز تک ایک عجیب سے نشے میں سرشار، اس کی طویل اور کشادہ شاہراہوں پر پھرتا اور قدم قدم پر اس کی رعنائیوں اور بوالعجبیوں کے سامنے سر جھکاتا رہا۔ لیکن پھر ایک شام کو جب میں کناٹ پلیس کے وسیع میدان میں جنگلے پر بیٹھا اپنے چاروں طرف گول دائرے میں پھیلی ہوئی دکانوں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا کہ مجھے قبلائی خاں کی طرح اپنے بزرگوں کی

پُراسرار آوازیں سنائی دیں ——— کہ او زُود فراموش! تُو نے دلّی پہنچ کر قطب مینار دیکھنے کا مصمّم ارادہ کیا تھا۔ دیکھ تیرے اُس ارادے کا کیا حشر ہوا! ——— میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ضمیر کی ملامت سے خود کو بچانے کے لئے بے تحاشا سڑک کی طرف بھاگنے لگا عین اس وقت میری نگاہ اُس موٹر رکشا پر پڑی، جو سڑک کے کنارے ایک عجیب کس مپرسی کے عالم میں کھڑی تھی اور جس کے ڈرائیور ——— ایک سردار جی، اپنی گدی پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ میں جب لپک کر رکشا میں سوار ہوا تو وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے مخصوص انداز سے میرا "سواگت" کرتے، میں نے انتہائی لجاجت سے ہانپتے کہا: ——— "قطب مینار، قطب مینار، سردار جی!!"

اب میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ اکثر لوگ جو قُطب مینار دیکھنے جاتے ہیں اشتیاقِ دید میں دُور ہی سے اُچک اُچک کر مینار کی جھلک پانے کی کوشش کرتے اور بیشتر اوقات کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اس سے حیرت و استعجاب کی وہ کیفیت بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے جو قطب مینار کو اچانک اپنے روبرو پانے میں حاصل ہوتی ہے۔ میرا یہ اُصول ہے کہ جب کبھی کسی "عجوبۂ روزگار" کو دیکھنے جاؤ تو اپنی فطرت کی سیماب وار اور اضطراری کیفیات کو پابہ زنجیر کر لو۔ بلکہ اگر ممکن ہو سکے تو اس بات کو ہی فراموش کر دو کہ تم کیا دیکھنے والے ہو۔ جو لطف کسی عظیم یا خوبصورت شے کو اچانک اپنے سامنے پانے میں ہے، اُس اہتمام اور تیاری سے بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے، جو اس تک پہنچنے میں صرف ہوتی ہے۔ یوں بھی شاید ہمارا تخیلی نظام مادی نظام سے کہیں زیادہ دلکش اور حیرت انگیز ہے اور جب ہم اپنے ذہن میں کسی شے کی پہلے سے ایک تصویر بناتے ہیں تو پھر اس شے کی اصل صورت اس تصویر کی جاذبیت سے کمتر ہی نظر آتی ہے۔ اور ہم رنج اور مایوسی کے ملے جُلے جذبات میں ڈوب کر سوچنے لگتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جنھوں نے اس شے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے محض ایک فریبِ نظر میں مبتلا تھے۔ اس سے ہمیں ایک احساسِ برتری بھی حاصل ہوتا ہے کہ ہم ہی وہ پہلے انسان ہیں۔ جس کی بدولت اس طلسم کا پردہ چاک ہوا ہے۔ تاہم یہ محض ایک خوش فہمی ہے۔ اور میں اس بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ چنانچہ اب جو میں قطب مینار دیکھنے

گیا تو قطب مینار کے خیال کو ذہن سے نکالنے کے لئے راستہ بھر سکھ ڈرائیور سے مختلف منڈیوں کے بھاؤ پوچھتا رہا۔ سردار صاحب کو اس بارے میں اتنی معلومات حاصل تھیں کہ مجھے ان کی وسعتِ نظر پر رشک آنے لگا۔ ایک آدھ بھاؤ کے سلسلے میں مجھے اِن سے اختلاف کی جرأت بھی ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنے دلائل کو اس شدّ و مد سے پیش کیا اور اپنے جوش و خروش میں موٹر رکشا اس بے تحاشا انداز سے چلائی کہ میں نے ان کے دلائل کے ختم ہونے کا انتظار کئے بغیر ہی گھٹنے ٹیک دئے اور اپنی شکست تسلیم کر لی ــــ سردار صاحب فوراً خوش ہو گئے اور میری بدقسمتی کہ اس خوشی میں انھوں نے موٹر کی رفتار بیس میل کا اضافہ کر دیا۔

بہر حال قطب مینار آ گیا۔ موٹر رکشا رُک گئی۔ اور میں رکشا سے اُتر کر نظریں نیچی کئے ہولے ہولے چلتا قطب مینار کے قدموں میں جا کھڑا ہوا۔ پھر میں نے آنکھیں مل کر اس کے مضبوط تنے پر ایک نظر ڈالی اور اس کا سہارا لے کر ہولے ہولے نگاہیں اُوپر کی سمت اٹھاتا چلا گیا۔ حتّٰی کہ میری گردن خم کھا کر دوسری طرف کو جھک گئی۔ اور سارا جسم ایک عجیب بے ڈھنگے طریق سے پچھلی طرف کو مڑ گیا۔

اب بزرگوں کے احکام کی تعمیل ہو چکی تھی۔ یعنی میں نے نہایت قریب سے قطب مینار کو دیکھ لیا تھا۔ اور حسبِ قاعدہ اس کی تاریخی عظمت کا تصوّر کر کے حیرت و استعجاب کے چند کلمات بھی مُنہ سے نکال دئے تھے ــــ کلمات، جنھیں سُن کر قطب مینار کے چوکیدار کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ اور اس نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے تیز تیز ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے واپس آنے کا ارادہ کیا تو اسے سیّاح کی فطری کمزوری سمجھئے یا جذبۂ تجسّس کو اس کی وجہ قرار دیجئے کہ میرے قدم موٹر رکشا کی طرف جانے کی بجائے از خود قطب کی سیڑھیوں کی طرف مڑ گئے اور میں آہستہ آہستہ اُوپر کو اُٹھنے لگا۔

قطب مینار کی کئی منازل ہیں اور ہر منزل پر زندگی اور کائنات کی ایک مختلف تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ میں جب پہلی منزل پر پہنچا، تو سڑک پر چلتے ہوئے انسان کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے دکھائی دئے۔ بڑے بڑے درخت چھوٹی چھوٹی

جھاڑیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور عمارتیں سکڑی ہوئی سی نظر آنے لگیں۔ دوسری منزل پر انسان قطعاً غائب ہو گئے۔ جھاڑیاں ننھے ننھے نقطوں کی صورت میں تبدیل ہو گئیں۔ اور عمارتوں کے پیٹ زمین کے ساتھ لگ گئے۔ تیسری منزل پر پہنچا تو اُفق بھی میرے ساتھ گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ زمین اُبھری اور اُبھر کر کشادہ ہو گئی۔ فاصلے سمٹے اور سمٹ کر قریب آ گئے اور نظر کی حدود حیرت انگیز طور پر پھیلتی چلی گئیں۔ لیکن جب میں آخری منزل پر پہنچا تو زمین کے سارے نشیب و فراز برابر ہو چکے تھے، اوپر آسمان کی بے پناہ وسعتیں تھیں، نیچے زمین کا کشادہ سینہ تھا اور اس کشادہ سینے پر نئی دلّی کی بلند و بالا عمارتیں چھوٹی چھوٹی سپید قبروں کی طرح پھیلتی چلی گئی تھیں۔ میں نے ان سے نظریں ہٹا کر قطب مینار کی طرف دیکھا ـــــ عمارتوں کے اس قبرستان میں میرؔ و غالبؔ کی دلّی اب بھی فاتحانہ انداز سے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں آسمانی رفعتوں کی طرف تھیں اور اس کے ہونٹوں پر ماضی کی ساری درخشندگی ایک ہلکا سا تبسم بن کر جگمگا رہی تھی۔

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے"

غالبؔ مُسکرا کر کہتا ہے ـــــ "یار! دیکھ یہ زندگی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ ہیں تُو یا وہ ـــــ سب موم کے پُتلے ہیں۔ موم کے پُتلوں کی لاف زنی یعنی چہ؟ اس لئے اے میرے پیارے دوست! مسکرا، دیکھ کسی نے ہم سے مذاق کیا ہے کیوں نہ ہم بھی اس سے مذاق کریں؟" مگر اقبالؔ اس طرح نہیں سوچتا۔ وہ بے حد سنجیدہ ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ وہ کہتا ہے ـــــ "دیکھو، تمہیں کیا ہونا چاہئے تھا۔ اور تم کیا ہو۔ اٹھو! اٹھو! کچھ بن جاؤ۔ اپنی شخصیت کی تعمیر کرو۔ دیکھو ہر چیز رواں دواں ہے۔ اس دوڑ میں خود کو نمایاں کرو۔ اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ سب کی نگاہیں تم پر جم کر رہ جائیں ـــــ" کتنا بڑا فرق ہے اِن دو بڑے شاعروں میں۔ اقبالؔ کو کچھ ہونے، کچھ بن جانے کی آرزو ہے ـــــ غالبؔ کچھ ہونے، کچھ بن جانے پر نادم ہے۔

نجانے آپ اِن میں سے کس کے ہم نوا ہیں؟ میں خود اس بارے میں موخر الذکر کا معتقد ہوں۔ مجھے شخصیت اور انفرادیت میں خاصی بڑی خلیج نظر آتی ہے۔ انفرادیت اپنے اندر کی دنیا سے آشنا ہونے پر نمودار ہوتی ہے۔ جب آپ لحظہ بھر کے لئے ارد گرد کی دنیا کو بھول کر اپنے دل کے نہاں خانے میں اتر جاتے ہیں تو آپ سے ایک انوکھی خوشبو آنے لگتی ہے۔ یہی

خوشبو غالب کے کلام سے بھی آتی ہے۔ لیکن جب آپ باہر کی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور دوسرے اشخاص کی نسبت سے اپنی ذات میں کوئی وصف پیدا کر لیتے ہیں تو آپ کی ذات کے گرد اگرد ایک رنگین اور منوّر سا ہالہ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی ہالہ آپ کی شخصیت ہے۔ انفرادیت سطح کے نیچے نمو پاتی ہے۔ شخصیت سطح سے اوپر روشنی پھیلاتی ہے۔ کتنا بڑا فرق ہے اِن دونوں میں!!

شخصیت! ——— شخصیت کوئی ایسا باریک سا ریشمیں نقاب نہیں جسے آپ پہن لیں تو چند لمحوں کے بعد آپ کو اس کے وجود کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ شخصیت تو ایک وزنی عمامہ ہے جو ہر لحظہ آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے اور ہر قدم پر آپ کو سربلندی کی دعوت دیتا ہے۔ اس طلسمی عمامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پہنتے ہی آپ کو ہر شے چھوٹی اور حقیر نظر آنے لگتی ہے اور آپ خود کو ہفت اقلیم کے تاجدار محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مزید برآں آپ کو انسانوں کا جمِ غفیر کیڑوں مکوڑوں کی طرح زمین کی سطح پر رینگتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے اور آپ کسی اونچے سنگھاسن پر بیٹھے، ایک نگاہِ غلط انداز سے ہر کس و ناکس کو مسترد کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے آپ اور آپ کے بھائی بندوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہوتی ہے جو پھر کبھی عبور نہیں ہو سکتی ——— اس کے برعکس انفرادیت آپ کو اونچے سنگھاسن سے نیچے اتارتی ہے۔ آپ کے سر سے عمامہ اُتار کر ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ اپنی نازک نازک انگلیوں سے آپ کی اکڑی ہوئی گردن کو سہلاتی ہے۔ حتےٰ کہ گردن کے پٹھوں میں لچک سی پیدا ہوتی ہے اور آپ گردن کو جھکا کر "اندر" کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ شخصیت، تصادم اور حرکت کی پیداوار ہے۔ لیکن انفرادیت، خاموشی اور عافیت سے جنم لیتی ہے۔

خود فطرت بھی تو شخصیت کی نفی کرتی ہے۔ درختوں کے کسی جھنڈ میں داخل ہو کر دیکھئے اپنے رنگ، رُوپ اور باس میں ایک پیڑ دوسرے پیڑ سے مختلف نہیں۔ بھیڑوں کے کسی گلّے کو ہانک کر دیکھئے اللہ میاں نے سب بھیڑیں ایک ہی سانچے میں تیار کی ہیں۔ انسانوں کے کسی گروہ پر نظر دوڑائیے۔ معمولی تبدیلیوں سے قطع نظر، بنیادی

صورت میں یک رنگی کا احساس ہوگا ——— پھر یہی نہیں، فطرت کا ہر جاندار اپنے پس منظر میں ضم ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ گلّے میں دوبارہ داخل ہونے پر اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ انسان، اپنے قبیلے یا گھر میں واپس آکر ہی مسرّت حاصل کرتا ہے۔ خود فطرت جزو کو کُل میں گُم کر دینے پر آمادہ ہے۔ طوطا سبز پتّوں میں غائب ہونے کے لئے سبز رنگ اختیار کرتا ہے۔ چیتا جنگل کی چتکبری فضا میں خود کو چھپانے کے لئے ویسا ہی اباس پہن لیتا ہے۔ رنگین پھولوں میں اڑنے والی تتلی خود بخود رنگین پروں سے خود کو مزین کر لیتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فطرت کی نظروں میں اخفا ہی تحفّظِ ذات کا بہترین حربہ ہے اور اخفا کیا ہے؟ ——— شخصیت کی نفی، جزو کا کُل میں گم ہو جانا، شے کا اپنے ماحول میں ضم ہو کر اپنی شخصیت کو مٹا دینا۔

لیکن اگر ہر شے اپنے پس منظر کی رِدا میں چھُپ جانے کو بے تاب ہے تو پھر ارتقا کس طرح ممکن ہے؟ اس کا جواب قطعاً مشکل نہیں۔ فطرت، شخصیت کی نفی کرتی ہے، کیونکہ شخصیت ایک ایسی شے ہے جو باہر سے عائد ہوتی ہے، از خود فطرت کی کوکھ سے جنم نہیں لیتی۔ دوسری طرف فطرت کی ہموار سطح کے نیچے انفرادیت کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ اس عمل کو دیکھنے کے لئے شہر کی فضا بالکل سازگار نہیں۔ کیونکہ وہاں تو پہلے ہی دھواں اگلتی چمنیوں اور شخصیتوں کا بول بالا ہے۔ اگر آپ فطرت کے اس خاموش عمل کو دیکھنے کے متمنّی ہیں تو میرے گاؤں میں آئیے۔ چند روز میرے دیہاتی مکان میں ٹھہریئے تاکہ میں آپ کو اپنے انوکھے تجربے سے آشنا کر سکوں تاکہ میں آپ کو بتا سکوں کہ فطرت کی خاموش سطح کے نیچے انفرادیت کی نمو کا عمل کس طرح جاری ہے۔ مثلاً میرے اس گندم کے کھیت پر ہی نظر دوڑائیے: دیکھئے یہ فصل کیسی ضعیف اور مدقوق سی ہے۔ موسمی تغیّرات، اندرونی امراض اور بیرونی حملوں نے اسے کمزور کر دیا ہے۔ لیکن اس کمزور فصل میں گندم کے اس خوشے کی طرف دیکھئے یہ کس قدر مضبوط، تازہ اور سربلند ہے۔ آپ پوچھتے ہیں یہ سربلند خوشہ کہاں سے آیا ہے؟ ——— یہ خوشہ از خود فطرت کی کوکھ سے اُبھرا ہے۔ یہ وہ دیدہ ور ہے جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، لیکن جب وجود میں آتا ہے تو اپنی نسل سے زیادہ توانا اور

سربرآوردہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ جس کے پَرتو نے اسے ایک انوکھی عظمت عطا کردی ہے۔ یہ عظمت اِس نے براہِ راست فطرت کی لازوال قوتوں سے اخذ کی ہے، اُس سماجی امتیاز سے حاصل نہیں کی جسے آپ شخصیت کا نام دیتے ہیں اور جو آپ کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے ——— میں خوش ہوں کہ میرے کھیت میں اس خوشے نے جنم لیا ہے اب میں اسے توڑوں گا، اس کے ہر بیج سے ایک نیا خوشہ پیدا کروں گا۔ اِن خوشوں سے میں پھر بیج نکالوں گا اور یوں کسی روز میری پیدا کی ہوئی گندم کی یہ قسم سارے کھیت میں لہلہائے گی۔ اس سے ارتقا کی دوڑ میں ایک نئے سنگِ میل کا اضافہ ہوگا اور میری اپنی جیب میں بھی کچھ سکّے کھنکنے لگیں گے۔

ایک بار نہیں، کتنی ہی بار میں نے خود کو اپنی شخصیت کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے پایا ہے جب ساون کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آتی ہیں اور آنگن میں "اہلِ وطن" لباس کے بندھنوں سے آزاد ہو کر نہاتے اور قہقہے لگاتے ہیں تو میں اپنی شخصیت، اپنے وقار، اپنے نام و نمود کے بوجھل احساس تلے سمٹ کر رہ جاتا ہوں۔ میں بھی لپک کر ان میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسا کر نہیں سکتا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شخصیت کا خول دراصل رُوح کا بندی خانہ ہے اور یہ بندی خانہ میں نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے ——— اس شاعر کی طرح جس نے خود کو ایک ذہنی قفس کے سپرد کر کے محبّت کے جذبے کو سلاخوں سے باہر ہی روک دیا تھا۔ پھر جب ایک دن اس نے قفس سے باہر نکل کر اڑنے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے پروں میں تو اڑنے کی سکت ہی باقی نہیں۔ شاید کسی روز میرا بھی یہی حال ہو۔ کیونکہ روز بروز میری شخصیت کے بوجھ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ میں اس آزادی سے محروم ہو رہا ہوں جو کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے اور جذبے کی ہلکی سے ہلکی تحریک پر لپک کر اُٹھنے اور بلاوجہ ناچتے چلے جانے میں مضمر ہے۔ لیکن نہیں! میں اپنے پروں کو مفلوج نہیں ہونے دوں گا۔ آج میں نے ایک انوکھا فیصلہ کر لیا ہے۔ خود کو آزادی دلانے، مصنوعی بندھنوں سے خود کو نجات دلانے کا فیصلہ۔ اگلے اتوار تک انتظار کیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ میں صبح اٹھتے ہی پہلے بالکنی میں کھڑا ہو کر ورزش کروں گا۔ پھر

دھوتی پہنے اور ایک چھڑی ہاتھ میں لئے، کوئی فلمی گیت گنگناتا بھرے بازار میں سے گزروں گا۔ لسی والے کی دکان پر کھڑا ہو کر لسی کا ایک لمبا سا گلاس غٹاغٹ پی جاؤں گا۔ پان والے کی دکان سے ایک موٹا سا پان لے کر اپنے کلّے میں دباؤں گا اور بازار میں سُرخ پیک سے چھڑکاؤ کرتا ہوا باغ کا رُخ کروں گا۔ چڑیا گھر پہنچ کر بندروں سے چھیڑ خانی کروں گا یا سبزے پر لوٹ پوٹ ہو کر زمین کی خوشبو سونگھوں گا یا گلہری کی تقلید میں کسی درخت پر چڑھ جاؤں گا۔ اور جب آپ کو کوٹ پتلون میں ملبوس، ہاتھ میں باریک سی چھڑی اور ہونٹوں میں سگار دبائے، باغ کی پختہ سڑک پر پھونک پھونک کے قدم رکھتے اور کسی گہرے خیال میں مستغرق گزرتے ہوئے دیکھوں گا تو درخت کے تنے سے کمر لگا کر اور درخت کی موٹی شاخ پر اپنی ٹانگیں پسار کر ایک ایسا بے ہنگم قہقہہ لگاؤں گا کہ درخت سے ننھی ننھی سنہری چڑیاں پھڑ پھڑا کر اڑ جائیں گی اور آپ یکایک چونک کر میری سمت دیکھیں گے اور پھر مجھے پاگل سمجھ کر جلدی جلدی قدم اٹھاتے، باغ میں سے لپکتے ہوئے باہر نکل جائیں گے۔

گرمی

جانے اب کے بہار اتنی مختصر کیوں تھی ؟ یہ نہیں کہ باغ میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا اور گل و بلبل کی داستان دہرائی نہیں گئی۔ یا نسیمِ سحر کے جھونکوں نے آدھ کھلی، شرمائی ہوئی کلیوں کے گھونگھٹ نہیں الٹے۔ یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن پھر بھی بہار اب کے برس کچھ معمول سے مختصر ہی تھی۔ وہ ایک نوخیز حسینہ کی طرح آمادۂ رقص تو ہوئی تھی، لیکن اس کے ہونٹوں سے گیت کا پورا بول بھی نہیں نکلا تھا اور اس کے پائل کی جھنکار نے ابھی بہار کے پجاریوں کو بیدار بھی نہیں کیا تھا کہ دفعتاً وقت کے بوڑھے دیوتا نے برہم ہو کر پردہ گرا دیا، فانوس بجھا دیئے اور بہار سے اس کے سارے نقرئی زیور چھین لئے —— اور یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہو گیا کہ کسی ذی روح کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ کب سرما رخصت ہوا اور کب گرمی اپنے نیم عریاں انداز سے بڑھ کر کونین پر چھا گئی —— جی ہاں! اب کے رخصت و آمد کا وہ درمیانی وقفہ بہت مختصر تھا، جب بہار اپنے سُریلے گیتوں اور دلہانہ رقص سے فضائے تیرہ کو منوّر اور عناصرِ فطرت کو مدہوش کرتی ہے اور سردی اور گرمی کے سنگم پر ہر سال فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی ہوئی آتی اور شکست و فنا سے ہم کنار ہو کر چلی جاتی ہے۔

لیکن جانے دیجئے، اب گزرے ہوئے ایّام پر آنسو بہانے کا فائدہ بھی تو کچھ نہیں —— سوچئے آخر بہار ہے کیا؟ اس کی اپنی مستقل حیثیت تو ہے نہیں۔ یہ شاعر لوگ تو ویسے ہی ہر گریز پا شے کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ جو شے بھی سُبک پا ہو، کھوئی کھوئی ہو، مختصر اور قلیل ہو، غرض جو شے ہاتھ نہ آ سکے، ان کی نظروں میں قیمتی اور اہم ہے۔ ورنہ میں پوچھتا ہوں بہار ہے کیا؟ ——

ایک دریوزہ گر جو سردی سے کیف اور گرمی سے حدّت حاصل کرتی ہے اور دو کیفیتوں کو ملا کر ایک ایسا مرکب تیار کرتی ہے جو ایک بھلے چنگے بے ضرر سے انسان کے احساسات میں بھی ہلچل اور جذبات میں تموّج پیدا کر دیتا ہے۔ بہار تو ایک شراب ہے جو مختلف اشیا سے مل کر بنتی ہے اور اسی لئے اس کا اپنا کیف ایک عارضی کیفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا —— سو اگر بہار چلی گئی اور گرمی نے اپنے پاؤں جمائے تو اس میں احساسِ زیاں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر آپ نے معاملہ ہی زیاں کے لئے کیا ہو تو الگ بات ہے!

مجھے گرمی بہت راس ہے۔ اگرچہ مزاج بلغمی نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں زندگی کے کسی بھی پہلو سے پوری طرح آشنا ہونے کے لئے اس بات کا متمنّی ہوتا ہوں کہ یہ پہلو کم از کم اتنا عرصہ ضرور قائم رہے کہ میں اس کی تمام ترکیبات کا مطالعہ کر سکوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے سردی میں بھی اگر کوئی خوبی نظر آتی ہے، تو بس اتنی کہ یہ بہار سے زیادہ طویل ہے اگرچہ اس خطّۂ مینو سواد میں کچھ ایسی طویل بھی نہیں۔ گرمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہار کی گریز پا دوشیزگی کی بجائے نسوانیت کی دیرپا پختگی کا پرتو موجود ہے۔ بے خودی و سرشاری کی بجائے اس کے سراپا میں، ایک ہلکی ہلکی، میٹھی میٹھی حرارت ہے جو طوفانِ بادوباراں میں ایک چنگاری کی طرح سلگتی ہے اور مطلع صاف ہو تو شعلے کی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔

گرمی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بہار کی طرح یہ اچانک وارد نہیں ہوتی۔ بہار کا تو یہ حال ہے کہ آپ کسی صبح حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ایک ہاتھ بڑھا کر نیم غنودگی کے عالم میں کھڑکی کا پٹ کھولتے ہیں اور اچانک بہار کا ایک معطّر جھونکا آپ کے بدن کو ایک انوکھے کیف سے سرشار کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ آپ آنکھیں ملتے ہوئے ایک نظر باہر کی دنیا پر ڈالتے ہیں۔ اور آپ کا دل

ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگتا ہے۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ آخر اتنے سارے سُرخ نیلے اور عنابی پھول رات ہی رات میں کہاں سے نمودار ہو گئے؟ شاخوں کے ننگے بازوؤں پر ہلکا ہلکا سبز رنگ کیسے آگیا؟ پھولوں پر رقص کرنے والی وہ نازک سی سنہری چڑیا کس انجانے دیس سے آپ کے پائیں باغ میں پہنچ گئی؟ آخر یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ —— لیکن آپ زیادہ نہ سوچیں کیونکہ زیادہ سوچنا لاحاصل ہے۔ بہار کا دستور یہی ہے کہ یہ اچانک آتی ہے۔ آپ کے گریبان پر ہاتھ ڈالتی ہے آپ پر خوشبو انڈیل دیتی ہے۔ آپ کا ہاتھ پکڑ کر چمن کے گوشے گوشے کا طواف کرتی ہے اور پھر اچانک کسی رات چپکے سے رخصت ہو جاتی ہے اور جب آپ اگلی صبح بیدار ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ محفل ویران ہے، ساز کے تار ٹوٹ چکے ہیں جام و سبو بکھرے پڑے ہیں اور فضا خون آشام ہو گئی ہے۔ بہار کی ہمیشہ سے یہی ریت ہے۔ جی ہاں! ہمیشہ سے یہی ریت ہے!

مگر گرمی! گرمی کی کیا بات ہے۔ اس کی آمد اچانک نہیں ہوتی۔ بے شک بعض ناتجربہ کار لوگ کسی روز اچانک کہہ اٹھتے ہیں —— اوہ گرمی آگئی! لیکن ان بے چاروں کو کیا خبر کہ گرمی کبھی اچانک وارد نہیں ہوتی۔ گرمی کا احساس تو خاموشی سے جنم لیتا ہے۔ ہولے ہولے پروان چڑھتا ہے۔ چپکے چپکے اپنے دائرۂ عمل کو بڑھاتا ہے۔ محبت اور گرمی سگی بہنیں ہیں۔ ان کی اچانک آمد کے پسِ پشت بھی ایک طویل داستان پھیلی ہوتی ہے —— پھر بہار کی طرح گرمی میں یک رنگی نہیں ہوتی۔ بہار میں مدوجزر کے امکانات کچھ زیادہ نہیں۔ یہ خوشبوئیں بکھیرتی آتی ہے اور خوشبوئیں بکھیرتی چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کا مزاج برہم نہیں اور عالم بھی شباب کا ہے تو آپ اس کی پاگل کر دینے والی کیفیات سے متاثر ہو کر چند لحظوں کے لئے اپنا گریبان چاک کر لیتے ہیں یا زیادہ مہذب ہوں تو ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر لیتے ہیں اور بس! لیکن گرمی کے انداز میں سمندر کی لہروں کا سا اُتار چڑھاؤ ہے اور پہاڑ کی پگ ڈنڈی کا سا پیچ و خم۔ یہ اگر آپ کے سر پر سولا ہیٹ رکھتی ہے تو بدن سے کوٹ اتار لیتی ہے۔ ذرا دیر کے لئے آپ کو طفلِ نوزائیدہ کی طرح۔ رسوم و آداب سے آزاد کرتی ہے۔ تو دوسرے ہی لمحے آپ کو مہذب لباس پہنا دیتی ہے ایک لحظہ کے لئے آپ کو اکساتی ہے کہ پیپل یا بکائن کی چھاؤں میں

جانا چاہئے اور دوسرے ہی لمحے آپ کو تاریک ترین گوشوں میں سمٹ جانے کی ترغیب دیتی ہے۔ گرمی کے توڈھنگ ہی نرالے ہیں اور ہر آن بدلتے ہوئے، اور شاید آپ نے سنا نہیں۔ ایک تغیّر ناآشنا جنّت سے ایک تغیّر پذیر جہنّم بہرحال بہتر جگہ ہے۔

لیکن بہار اور گرمی کا فرق محض خارجی مظاہر تک ہی محدود نہیں۔ یہ فرق دراصل ذہنی سطح پر پہنچنے کے بعد ہی اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ انسانی ذہن پر بہار کے اثرات سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔ مسرّت، رقص، نغمہ، آنسو اور قہقہے، غرض کہ جذبات کے سب شدید مظاہر بہار کی مسحور کن کیفیات ہی کے رہینِ منّت ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار ہمیں واپس ہمارے بچپن میں پہنچا دیتی ہے۔ اور ہم معمولی سے معمولی تحریک پر کپڑے پھاڑنے، ناچنے اور تھرکنے یا آنسو بہانے اور قہقہے لگانے پر خود کو مائل پاتے ہیں۔ بہار میں جذبات و احساسات پر تہذیب و تمدن کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور آزاد منش آدم اپنے اصلی رُوپ کی جھلک دکھانے پر تُل جاتا ہے۔ لیکن ذہنِ انسانی پر گرمی کے اثرات مختلف نتائج پیدا کرتے ہیں۔ بہار اگر دیوانگی کو تحریک دیتی ہے تو گرمی "فرزانگی" کو حرکت میں لاتی ہے۔ بہار میں انسانی فکر پر بوجھل جذبات کا تسلط قائم ہو جاتا ہے، تو گرمی میں انسانی فکر جذبات کو زیر کر لیتا ہے۔ بہار سطحیت میں لپٹی ہوتی ہے اور گرمی میں تاریک کنوئیں کی سی گہرائی ہے۔ گرمی اگر ہمارے احساسات کو شل اور ہمارے جذبات کو مفلوج کرتی ہے، تو ہماری لازوال ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو تحریک دینے میں بھی کامیاب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب بڑے بڑے پیغمبر اوتار اور رشی منی ہمیشہ گرم ممالک ہی میں پیدا ہوئے!

مجھے گرمی بہت پسند ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں کوئی اوتار یا رشی منی بن کر آپ سے ہمکلام ہونا چاہتا ہوں، بلکہ اس لئے کہ یہ مجھے اپنے اندر جھانکنے پر مائل کرتی ہے۔ سردی اور بہار میں تو جسمِ نحیف پر اتنے غلاف چڑھے ہوتے ہیں اور چائے کے گرم گرم گھونٹ اس تیزی سے اندرونی نظام میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں کہ کوشش کے باوجود آئینہ دل گدلا ہی رہتا ہے۔ لیکن گرمی کا شفّاف پانی میری نگاہوں کے سامنے کوئی دیوارِ سنگ کھڑی نہیں کرتا اور

غلافوں کی عدم موجودگی میری نظروں کو جسمانی نظام سے روشناس کرانے میں بھی مدد دیتی ہے ——— رات کا وقت ہے، ہوا کا سانس بند ہے، چھوٹے بڑے گرمی کے ہاتھوں تلملا رہے ہیں اور میں اپنے مکان کی تیسری چھت پر لیٹا، قمیص اتارے اور دھوتی باندھے تاروں بھرے آسمان کے نیچے ایک عجیب سے سکون سے خود کو ہم کنار پاتا ہوں۔ میری نظریں سب سے پہلے سانس کی آمد و رفت کا جائزہ لیتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ فضا میں تو ہوا کا نام و نشان تک نہیں لیکن میرے سینے میں سانس کی آمد و رفت جاری ہے۔ یہ کیسا معجزہ ہے؟ اور اچانک مجھے اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ سانس کی آمد و رفت ہی نہیں بلکہ میرا تو سارا جسم ہی ——— ایک ایسی حیرت انگیز مشین جو سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے دن کے چوبیس گھنٹے، مہینے کے تیس دن اور سال کے بارہ مہینے ایک لحظہ رُکے بغیر چلتی رہتی ہے۔ اور پھر پچاس، ساٹھ، اسّی اور بعض اوقات سو سال سے زیادہ عرصہ تک نان سٹاپ چلتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ نہیں؟ یہ مشین اپنا ایندھن کس طرح حاصل کرتی ہے؟ کس مکمل نظام کے تحت میرا ہر موتے بدن معمولی سے معمولی تحریک پر ایک نمایاں ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے؟ میرے جسم کا ہر پرزہ کس حیرت انگیز باقاعدگی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتا ہے؟ ——— اور یہ میرے جسم تک ہی تو محدود نہیں۔ زندگی جہاں کہیں بھی ہے، شجر میں، حجر میں، چرند میں، پرند میں اس کا انداز انوکھا اور البیلا ہی تو ہے۔

میرے جسم پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے ہیں۔ شاید ہوا کا سانس کچھ اور رُک گیا ہے۔ میں نے اپنے بدن سے نگاہیں ہٹالی ہیں۔ ایک نظر آسمان کی وسعتوں پر ڈالی ہے اور دفعتاً میرا دل زور سے دھڑک اٹھا ہے ——— آسمان پر کوئی دُھند نہیں، کوئی بادل نہیں، چاند کی روشنی تک نہیں، صرف لاکھوں کروڑوں ستاروں کی انجمن موجود ہے اور انجمن بھی ایسی کہ اس کا ہر رُکن دوسرے رکن سے لاکھوں کروڑوں سالہائے نور کے فاصلے پر ہے۔ یہ کیسی کائنات ہے جس میں میری زمین کو ایک معمولی اور حقیر ذرے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں اور جس کے مقابلے میں میرے ننھے ننھے آلام و مصائب اور چھوٹی چھوٹی طفلانہ مسرتیں بالکل بے معنی ہیں۔ کتنی عجیب ہے یہ کائنات جس میں وقت کوئی شے نہیں۔ یا شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ جہاں وقت کا تصوّر ہمارے محدود تصوّر سے قطعاً مختلف ہے۔ ہمارا زمینی وقت تو آگے ہی آگے بڑھتا ہے۔

اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی اسے عادت نہیں جو لمحہ گزر جاتا ہے وہ ماضی بن جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر آ نہیں سکتا۔ لیکن کائناتی وقت آگے کی طرف بھی دوڑتا ہے اور پیچھے کی طرف بھی۔ اور اس کا ہر لمحہ خود کو سدا دہراتا رہتا ہے ـــــ وہ ننھا سا ڈبڈباتا ہوا ستارہ شاید کبھی کا فنا ہو چکا۔ لیکن ابھی کروڑہا سال اس کی روشنی مجھ تک پہنچتی رہے گی۔ اور شاید وسیع و لامحدود کائنات میں کبھی فنا نہیں ہو سکے گی۔ پھر تمام اشکال دراصل نور کی اشکال ہیں۔ آج صبح میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اس سامنے والے پہاڑ کی تصویر بنانے کے لئے کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچی تھیں۔ چند لمحوں میں یہ کام ختم ہو گیا تھا۔ اور جب میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تھا تو یہ سارا عمل میرے ماضی کا ایک حصّہ بن چکا تھا۔ لیکن کائناتی وقت کا یہ معجزہ ہے کہ میرا کاغذ پر آڑے ترچھے نقوش ڈالنے کا یہ عمل کبھی ماضی نہ بن سکے گا۔ اور آج سے ہزاروں لاکھوں برس بعد اگر کوئی شخص کسی اور سیّارے میں بیٹھا ہوا میری زمین پر مشینی نظریں گاڑے گا تو میں اسے کاغذ پر لکیریں کھینچتا ہوا صاف نظر آ جاؤں گا۔ عجیب بات ہے نا! فنا اور شکست کے باوجود یہ ازلی و ابدی کیفیت! عجیب ہے یہ کائنات اور عجیب ہیں اس کے مظاہر! مگر نہیں؟ شاید ہماری حالت محض اس مچھلی کی سی ہے۔ جو سمندر کی تہ میں رہتی ہے اور سمندر سے باہر کی دنیا کے بارے میں وثوق کے ساتھ باتیں کرتی ہے۔ ہم بھی تو ہوا کے سمندر کی تہ میں رہتے ہیں! اگر موسم سردی کا ہوتا یا چاروں طرف بہار کی رعنائیاں بکھری ہوتیں تو میں ایسے موقع پر ہزار چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں میں خود کو منہمک کر سکتا تھا۔ لیکن گرمی کے موسم کی یہ خوبی ہے کہ یہ آپ کے خیالات کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ صوفیا کا قول ہے کہ روحانی عظمت کے راستے میں انسانی جسم بہت بڑا پتھر ہے۔ وہ بالکل سچ کہتے ہیں۔ مجھے اس کا تجربہ گرمی کی ہر گرم رات کو ہوتا ہے جب جسم کے ساتھ روح کا رشتہ کچی ڈور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور میری روح فضائے بسیط کی پہنائیوں میں پرواز کے لئے پر تولنے لگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ کائنات کب شروع ہوئی؟ اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ ستارے ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کس انوکھے دیار کی طرف اڑے چلے جا رہے ہیں؟ اس کائنات ـــــ اندھی اور بہری کائنات کی اِن پُراسرار چالوں پر کون مسکرا رہا ہے؟ اور کون ہے جو اس کا ادراک کرتا

ہے ؟ ـــــ پہاڑ اور درخت خاموش ہیں۔ عظیم اور ہیبت ناک ستارے اپنی ہی آگ میں جل رہے ہیں اور چرند و پرند کی ذہنی صلاحیتیں صفر کے برابر ہیں تو پھر اس نظامِ عالم میں کون زندہ و متحرک ہے ؟ کیا انسان ؟ تو پھر جس طرح انسانی جسم کا مرکز انسانی دماغ ہے کہیں ویسے ہی نظامِ عالم کا مرکز انسان تو نہیں جو اپنی عظیم کائنات کے بارے میں سوچتا ہے، غور کرتا ہے اور کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی سعی میں ہے۔ چاہے یہ نتیجہ کتنا ہی کم زور اور مضحکہ خیز کیوں نہ ہو ـــ اور اب گرمی کے ہاتھوں میری بچی اچانک رونا شروع کر دیتی ہے اور میں ستاروں کی دنیا سے واپس اپنے عالمِ خاکی میں پہنچ جاتا ہوں۔ اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے سوچتا ہوں کہ زندگی تو نور، حرکت اور حرارت یا بالفاظِ دیگر گرمی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر یہ گرمی نہ ہوتی تو کائنات میں زندگی کہاں سے آتی۔ میں کیوں کر وجود میں آتا اور میری یہ سوچ بچار کیسے جنم لیتی ؟؟

ٹریول لائٹ

پچھلے جمعہ کی بات ہے مجھے اپنے ایک عزیز دوست کی خطرناک علالت کا تار موصول ہوا تھا اور میں ریل کے انتظار میں پلیٹ فارم پر بڑی بے قراری سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک مجھے "السّلام علیکم" کا ایک فلک شگاف نعرہ سنائی دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو شیخ گ ـــــ تھے جن کے ایک ہاتھ میں ترکاری کا تھیلا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے دو مکروہ صورت بچے چمٹے ہوئے تھے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے ـــــ "دیکھئے آغا صاحب میں ایک الجھن میں مبتلا ہوں"۔ میں نے اپنے چہرے پر مسرّت اور اخوّت کے سارے پاکیزہ تاثرات پیدا کرتے ہوئے پوچھا ـــــ "کیسی الجھن شیخ صاحب؟" وہ مسکرائے، پھر یک لخت سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے ـــــ "مشرقی فلسفے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ حیران ہوں کس جگہ سے اس کا آغاز کروں؟" میں اس انوکھے اور غیر متوقع سوال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا تاہم میں نے بے ساختہ کہا ـــــ "جگہ کا کیا ہے! یہیں سے شروع کر دیجئے"۔

"یہیں سے، یعنی ریلوے پلیٹ فارم سے؟" ـــــ انھوں نے حیرت سے پوچھا اور پھر جب انھیں میری طنز کی جراحت محسوس ہوئی تو بڑی حقارت سے مجھے گھورتے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے ـــــ "اونہہ ریلوے پلیٹ فارم سے!"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے بعض دوستوں کی محفل میں میرے دماغی توازن کے بارے میں چند "خوشگوار" تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، بہرحال مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں!

لیکن اب جو اس چھوٹے سے واقعہ پر غور کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ایک لمحۂ خود فراموشی میں کتنی بڑی بات میرے منہ سے نکل گئی ہے۔ کیونکہ فی زمانہ زندگی کی بے ثباتی، فنا اور تغیر کا وہ احساس صرف ریلوے پلیٹ فارم پر ہی پیدا ہو سکتا ہے، جو مشرقی فلسفے کا منبعِ اعظم ہے۔ آپ کو کبھی موقعہ ملے تو ریلوے پلیٹ فارم کے کسی بنچ پر اطمینان سے بیٹھ جائیے اور اپنے چاروں طرف "بڑھتے، گرتے اور مرتے ہوئے ہجوم کے بھنور" پر ایک نگاہ ڈالئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ زندگی اپنی تمام تر ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ پلیٹ فارم کی مختصر سی سطح پر نمودار ہو گئی ہے ـــــ شیکسپیئر نے ایک جگہ دنیا کو سٹیج سے تشبیہ دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شیکسپیئر کے زمانے میں ریلوے پلیٹ فارم بن چکا ہوتا تو وہ کبھی اس خوفناک غلط بیانی کا مرتکب نہ ہوتا ـــــ فی الاصل ایک ریلوے پلیٹ فارم بالکل ہماری دنیا کی طرح ہے۔ یہاں مسافروں سے لدی ہوئی گاڑیاں آتی ہیں اور یہاں سے مسافروں سے لدی ہوئی گاڑیاں نامعلوم منازل کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ گھبرائے ہوئے مسافر یہاں اترتے اور گھبرائے ہوئے مسافر یہاں سے سوار ہوتے ہیں۔ دُنیا کی طرح پلیٹ فارم کا ماحول بھی ثبات سے ناآشنا اور تغیر سے ہم آہنگ ہے۔ بھلا مشرقی فلسفے کے مطالعہ کے لئے اس سے موزوں صورتِ حال اور کیا ہو سکتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جو میری طرح سوچ بچار جیسے خطرناک اور قابلِ نفرت عارضے میں مبتلا ہیں، ریلوے پلیٹ فارم کے ماحول ہی سے استفادہ کرتے ہیں، اس کے بعد وہ غالباً سیدھے اس مقام کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں جو کہنے کو تو اہلِ جنوں لیکن دراصل اہلِ دانش اور اہلِ فن کی آخری آرام گاہ ہے۔ مگر یہاں اس کے تذکرے کی کیا ضرورت ہے؟

ریلوے پلیٹ فارم کے ماحول سے اکتسابِ علم تو غالباً ایک خالص شخصی مسئلہ ہے۔ لیکن ریلوے حکّام کے وہ اقدامات عالم گیر اثرات کے حامل ہیں جن کی مدد سے وہ اہلِ وطن کے خالص مادی میلانات کو تبدیل کرنے کی سعی کرتے اور ان کے دل میں روحانیت کی ایک ننھی سی قندیل روشن کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ـــــ میرا اشارہ ان چند ریلوے

اشتہارات کی طرف ہے جنھیں ریلوے حکام بڑی سوچ بچار اور بحث وتمحیص کے بعد ترتیب دیتے اور اس فن کارانہ انداز سے پیش کرتے ہیں کہ مسافروں کی تیرہ وتار دنیا میں چکاچوند پیدا ہوجاتی ہے اور ان کی ایک ہی ڈگر پر چلتی ہوئی گاڑی یک لخت دوسری پٹڑی پر دوڑنے لگتی ہے۔ ان میں سے محض ایک اشتہار کا ذکر کرتا ہوں جو آج کل تقریباً ہر ریلوے پلیٹ فارم کی زینت ہے اور چند گہرے علمی انکشافات سے خلقِ خدا کی پُرزور خدمت کر رہا ہے۔ اس اشتہار میں ایک ایسا مسافر پیش کیا گیا ہے جس کے شکمِ مبارک کا بیضوی دَور شرقاً غرباً تا حد تصویر پھیلا ہوا ہے اور جس کے لئے ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر ہے۔ اس مسافر کے عقب میں ایک مریل سا قلی ہے جس کے سر پر صندوقوں اور بستروں کا ایک خاصا بڑا اہرام نظر آرہا ہے۔ اس اہرام کی چوٹی پر ایک پنجرہ ہے جس میں میاں مٹھو تشریف فرما ہیں اور اپنے نیچے گزرتے اور بھاگتے ہوئے جمِ غفیر کو بنظرِ استہزا دیکھ رہے ہیں۔ اشتہار کے نیچے صرف دو لفظ لکھے ہیں ـــــ ٹریول لائٹ (Travel Light.) اور اس کے بعد اشتہار ختم ہوجاتا ہے۔

آپ غالباً کہیں گے یہ کیا بات ہوئی؟ اور اس میں فلسفیانہ نکتہ کہاں پیدا ہوا ہے ـــــ دراصل اگر آپ کو سوچ بچار کی عادت نہیں ہے تو آپ یہ غیر علمی سوال ضرور کریں گے لیکن اگر آپ نے میری طرح "گلستان بوستان" کا بغور مطالعہ کیا ہے تو آپ غالباً ایسی جلد بازی اور سطحیت کا مظاہرہ ہرگز نہیں کریں گے۔ بلکہ بات کی تہہ تک پہنچ کر ان ریلوے حکام کو دُعائے خیر سے یاد کریں گے۔ جنھوں نے آپ کو یہ قیمتی نکتہ محض ایک ٹکٹ کے عوض مہیا کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نکتہ کیا ہے۔

"ٹریول لائٹ" ـــــ یہ جادو کے الفاظ سم سم کی کلید ہیں اور ان کے زبان پر آتے ہی زندگی کے غار کا دہانہ یک لخت کھُل جاتا ہے اور آپ کے محسوسات میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہونے لگتا ہے، آپ دفعتہً سوچتے ہیں کہ ہم سب مسافر ہیں جو زندگی کے اس پلیٹ فارم کو عبور کر رہے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کے عقب میں اس کا ہمزاد بڑھا چلا آرہا ہے۔ اس ہمزاد کے سر پر صندوقوں اور بستروں کا ایک اہرام بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ ایک صندوق میں اس کی

زندگی کا مادی اثاثہ بند ہے ـــــ اس کا مکان، دولت، زمین، ملازمت وغیرہ۔ اس سے اوپر ایک بیگ ہے جس میں اس کی بیوی بچے، عزیز و اقارب، دوست احباب بند پڑے ہیں۔ اس کے بعد سماجی روایات، ملکی قوانین، اخلاقی اصول، مذہبی رجحانات اور تجربات و حوادث کے کتنی ایک بستر ہیں ـــــ اور ان سب کی چوٹی پر ایک پنجرہ ہے جس میں اس کی روح ایک خانماں برباد شہزادے کی طرح قید ہے اور زندگی کے گزرتے ہوئے کارواں کو اداس اداس نظروں سے دیکھ رہی ہے ـــــ ریلوے اشتہار کا خالق حیران ہے کہ ہم لوگ اتنا بوجھ اٹھائے کس طرح سفر کر سکیں گے۔ اُسے ڈر ہے کہ یہ بارِ گراں ہماری کمریں توڑ دے گا۔ ہم اس بوجھ تلے پس کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ وہ ایک بڑے واضح اشارے میں آپ سے کہتا ہے ـــــ "اے زندگی کے مسافر! تو اپنے ہمزاد کو زور سے دھکا دے، اتنے زور سے کہ وہ پلیٹ فارم پر اوندھے منہ جا گرے اور تو خود بھاگ کر اس دوڑتی ہوئی ٹرین میں سوار ہو جا ـــــ جو تجھے "سنیاس" کے ریگستان سے گزار کر "نروان" کی منزل تک لے جائے گی اور جہاں پہنچ کر تو زندگی اور موت کی کش مکش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گا۔

یہ ہے مشرقی فلسفے کا لُبِ لباب جسے ریلوے حکام نے بڑے آسان طریقے سے آپ تک پہنچایا ہے۔ ویسے تاریخی لحاظ سے دیکھئے تو ریلوے حکام کا یہ اقدام کوئی اجتہادی عمل نہیں بلکہ صرف اس عظیم قدم کی صدائے بازگشت ہے، جو آج سے ہزاروں برس قبل کپل وستو میں اٹھایا گیا تھا اور جس کے کارن ایک شہزادے نے اپنی مملکت دولت، جاہ و حشمت، بیوی اور بچے کو الوداع کہی تھی۔ اور ایک اندھیری شب ٹریول لائٹ کا جیتا جاگتا اشتہار بن کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس شہزادے کو آج ہم گوتم بُدھ کے نام سے جانتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ٹریول لائٹ کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ بُدھ کے بعد ان ہزاروں لاکھوں سادھوؤں اور فقیروں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں جو اپنا سب کچھ تیاگ کر اور اپنے جسموں پر بھبھوت مل کر گھروں سے نکلتے رہے اور ٹریول لائٹ کے علم بردار بن کر زندگی کی شاہ راہ پر سفر کرتے رہے۔ البتہ بیسویں صدی میں ہندوستان نے اس عظیم فلسفے کے دو نئے علم بردار پیدا کئے ہیں۔ گاندھی اور بھاوے اور پھر

وہ شعر بھی تو ہے: ؎

گاندھی از گجرات، بھاوے از دکن!
ننگے پاؤں، ننگے سر، ننگے بدن!

بہرحال ان قلندروں کا دائرہ عمل ہمیشہ سے کچھ محدود ہی رہا ہے اور پھر ان کا طریق کار بھی سائنٹفک نہیں تھا۔ اب بات ریلوے حکام کے ہاتھ میں آگئی ہے تو اس کے عالم گیر اور دور رس نتائج بھی برآمد ہوں گے اور اگر کوئی غیر معمولی حادثہ سدِّ راہ نہ ہوا تو اس بات کو طے سمجھئے کہ آئندہ چند برس میں ہم سب نروان حاصل کرلیں گے۔ انشاء اللہ۔

آگ تاپنا

آگ تاپنا ایک فن ہے۔ جس طرح محبت کرنا ایک فن ہے۔ پھر جس طرح ہر فن کے چند مقتضیات ہوتے ہیں، آگ تاپنے کا فن بھی اپنے پرستار سے جسم و روح کی بعض پابندیوں کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ آگ سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان نہ صرف اپنے آئینہ دل میں آگ کے شعلوں کو منعکس دیکھے، بلکہ ان رسوم و قیود کا احترام کرنا بھی سیکھے جو آتش کدے کی روایات اُس پر عائد کریں۔

گھبرائیے نہیں! یہ فن مشکل ضرور ہے لیکن جوئے شیر لانے کے مترادف ہرگز نہیں اور پھر اگر اس کی بعض موٹی موٹی باتیں شروع ہی میں ملحوظ رہیں تو بلندی کی مشکلات بڑی حد تک کم ہو سکتی ہیں۔ اس ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ ازل سے ہمارے یہاں آگ تاپنے کے لئے صرف چالیس روز مقرر ہیں اور جو شخص ان چالیس دنوں سے پہلے آگ تاپنے کا مشغلہ اختیار کرتا ہے، یا اس عرصے کے بعد بھی اس مشغلے کو جاری رکھتا ہے تو نتائج کی تمام تر ذمہ داری اس شخص پر ہے۔ تاہم بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ مشکل یہ ہے کہ آج تک ان چالیس دنوں کا تعین بھی تو نہیں ہو سکا۔ اس ضمن میں کیلنڈر تو خیر قطعاً بے کار ثابت ہو چکا ہے اور اس کی بڑی وجہ

محض یہ ہے کہ اس عرصے کی حدود خود سر لہروں کی طرح آگے پیچھے ہوتی رہتی ہیں۔ اور کسی انسانی یا میکانکی طرز عمل کے تابع رہنا پسند نہیں کرتیں۔ تو پھر مبتدی آتش پرست کیا کرے؟ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اسے آگ تاپنے کا صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے یا تو اس فن کے بعض اماموں کی پیروی کرنا ہوگی یعنی جب وہ تاپیں تو یہ بھی تاپنا شروع کر دے، جب وہ ٹھنڈے پڑ جائیں تو یہ بھی کنارہ کش ہو جائے اور یا اسے اپنی چھٹی حس کو بیدار کرنا ہوگا، تاکہ اسے خود ہی معلوم ہو جائے کہ آگ تاپنے کا موزوں ترین لمحہ کون سا ہے؟

لیکن اس سے پیشتر کہ مبتدی کی یہ چھٹی حس بیدار ہو، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس سلسلہ میں بعض خارجی حالات و واقعات بھی خاصے اہم ہیں۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ آگ تاپنے کے لئے اس روز کا منتظر رہتا ہوں جب سرما کا پہلا بادل بڑے بڑے سیاہ لحافوں کی صورت بساطِ فلک پر پھیل جاتا ہے اور یہ لحاف کارواں در کارواں گرج اور چمک سے ناآشنا، کسی مجبور کی آنکھوں کی طرح دھیرے دھیرے برستے، افقِ مشرق کی طرف اڑے چلے جاتے ہیں اور سردی کی ایک تیز لہر ہر موئے بدن کی تہہ تک اترنے لگتی ہے۔ جب خارجی ماحول یہ صورت اختیار کر لے تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ آگ تاپنے کا موسم قریب آ رہا ہے لیکن بعض ناتجربہ کار حضرات کی طرح میں اس بارے میں عجلت پسندی کا شکار نہیں ہوتا اور چونکہ اس فن کے مقتضیات سے کماحقہ آشنا ہوں۔ لہٰذا فوراً ہی جلتی آگ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اس قیمتی کیفیت کو کند نہیں ہونے دیتا جو آگ کے ہر پُرخلوص پرستار کو زود یا بدیر حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اس وقت تک انتظار کرتا ہوں جب تک میرے جسم و روح کی حرارت کم ہوتے ہوتے اس مقام تک نہ پہنچ جائے جو اس کی آخری حد ہے اور جس سے آگے سرما کی ابدی کیفیتوں کا راج ہے جب یہ مقام آ جاتا ہے، تو میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے خاموش اور سرد کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں اور انگیٹھی میں سجی ہوئی لکڑیوں کے سامنے ایک کرسی پر جا بیٹھتا ہوں۔ کچھ دیر ان لکڑیوں کو بغور تکتا رہتا ہوں۔ تاکہ ان کی خنک و جامد زندگی سے قدرے ہم آہنگ ہو سکوں اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میری رگوں کا خون بھی اب منجمد ہونے

لگا ہے تو ہولے سے ان کے درمیان آگ کا ایک ننھا سا شعلہ روشن کر دیتا ہوں۔ پھر جب لکڑیوں کی یہ چتا جلنے لگتی ہے اور لکڑیوں کی سخت اور کرخت جلد آگ، شعلے، دھواں اور راکھ کے مختلف مراحل سے گزرنے کا عمل شروع کر دیتی ہے تو میں جیبوں سے اپنے دونوں ہاتھ نکال کر آگ کے سامنے اس انداز سے پھیلا دیتا ہوں گویا کسی آتشیں سیل کو روکنے کی کوشش میں ہوں۔ شعلوں کی حرارت دھیرے دھیرے ہاتھوں سے ٹکراتی، کسی گرم رَو کی طرح میری رگ رگ میں اترتی چلی جاتی ہے۔ تا آنکہ میرے سینے میں بھی ایک ننھی سی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے گویا میں نے آتشِ لرزاں سے اکتسابِ نُور کر لیا ہے۔ اور خود بھی اس جلتی اور تڑپتی ہوئی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک بن گیا ہوں، جیسے میری بے حس روح کا ہر تار، میرے منجمد جسم کا ہر عضو پگھل کر اس سیلِ آتشیں میں ضم ہو گیا ہے۔ اس لمحۂ تابناک میں معاً مجھے یہ خیال آتا ہے کہ لکڑی کے جلنے اور زندگی کے گزرنے میں کس قدر مماثلت ہے! لکڑی ایک طرف سے جلتی ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک سُرخ سا شعلہ ناچتا ہے جو اپنے قد کے مطابق انگیٹھی کے نُور میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح میں نے خود کو ایک طرف سے آگ لگا رکھی ہے اور ہولے ہولے جلتا، محبّت، علم اور ہمدردی کا نُور یا برائی، گناہ اور کثافت کا دھواں پھیلاتا، بجھتا چلا جا رہا ہوں اور ایک روز اسی جلتی ہوئی لکڑی کی طرح مجھے بھی راکھ اور کوئلے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جانا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ انگیٹھی کی بعض لکڑیاں بیک وقت دونوں اطراف سے جل رہی ہیں۔ یہ لکڑیاں ایک وقت میں روشنی کا بہت بڑا منبع کہلاتی ہیں لیکن بہت جلد ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو اپنی حیاتِ مختصر کو مٹھیاں بھر بھر کر لٹاتے ہیں اور مختصر سے عرصے میں کسی شہابِ ثاقب کی طرح جلتے اور دوڑتے، ابدی تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں، لیکن جن کی درخشندہ گزرگاہ عرصۂ افلاک کو بڑی دیر تک منوّر رکھتی ہے۔

شعلہ و دود کی کش مکش اب ختم ہو گئی ہے اور انگیٹھی بڑے بڑے آتشیں پھولوں کی سیج بن گئی ہے۔ آگ تاپنے کا آسمانی لمحہ اب قریب تر ہے۔ وہ لمحہ جس کے لئے میں ایک طویل مدت سے سراپا انتظار ہوں۔ اب مجھے آتش پرستی کی بعض دوسری رسوم کی طرف متوجّہ ہونا چاہئے

چنانچہ میں اُٹھ کر اندر سے دروازہ مقفل کر لیتا ہوں۔ کیونکہ اس عمل کے لئے مکمل تنہائی ازبس ضروری ہے۔ پھر میں تپائی پر رکھے ہوئے لمپ کو بجھا دیتا ہوں اور وہ شرمیلی تاریکی جو کھڑکیوں سے باہر سہمی کھڑی تھی، چشم زدن میں لپک کر کمرے کی تمام اشیا پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ میرا کمرہ اب تاریکی اور تنہائی کا مسکن ہے۔ یہاں صرف دو ہستیاں زندہ و روشن ہیں ـــــ انگیٹھی اور میں! میرے احساسات کی صورت اب تیزی سے تبدیل ہوتی ہے۔ باہر کائنات میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، آسمان ایک تاریک ساخول بن گیا ہے اور بادل رِم جھم رِم جھم برستے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے عین باہر پیپل کا درخت اب بالکل بھیگ گیا ہے۔ اس کی ٹہنیاں گیلی اور بوجھل ہو کر ڈھلک گئی ہیں۔ لیکن کمرے کے اندر میں نے خود کو انگیٹھی کی گرم و گداز آغوش کے سپرد کر دیا ہے اور ایک عجیب سی طلسمی، پُراسرار کیفیت میرے رگ و پے پر مسلّط ہو رہی ہے، مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھ میں پھیلنے، بڑھنے اور اڑنے کی کوئی بھی خواہش باقی نہیں رہی، جیسے میں لمحہ بہ لمحہ سمٹتا چلا جا رہا ہوں، میرے افکار پابہ گِل ہو گئے ہیں اور خود فراموشی کی ایک گرم و گداز رو انگیٹھی کی آغوش سے نکلتی ہوئی مجھے لحظہ بہ لحظہ اپنے بازوؤں میں جکڑتی چلی جا رہی ہے۔ انگیٹھی ماں کی گود کی طرح ہے، وہ گود جس میں کوئی بغاوت، کوئی شعلہ، کوئی اضطراب باقی نہیں رہتا، صرف مامتا کی ہلکی ہلکی، میٹھی میٹھی حرارت ہوتی ہے۔ جو ہر شے کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ غنودگی اب میرے پپوٹوں پر رینگ رہی ہے اور یہ پپوٹے پیپل کی ٹہنیوں کی طرح بھاری ہو کر ڈھلکنے لگے ہیں۔ کوئی دم میں یہ پردے گر جائیں گے اور میں گہری میٹھی نیند سو جاؤں گا۔ لیکن کم از کم اس وقت تک ایک ایسی کیفیت ضرور طاری رہے گی جو صرف آگ تاپنے والے ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اور جو میری نظروں میں زندگی کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

بارش کے بعد.....

کل شام تک مطلع گرد آلود تھا۔ اڑتے ہوئے ذرّوں کی ردا خاک و افلاک پر چھائی ہوئی تھی۔ اور مجھے دن میں کئی بار محسوس ہوتا تھا گویا میں گرد کے زنداں میں محبوس ہو گیا ہوں۔ پھر یہ قصّہ ایک دن کا نہیں۔ پچھلے دس روز سے گرد کا یہی عالم تھا۔ میرے کمرے کی ہر شے کرسی، میز، قلم دان، لکھنے کے کاغذ غرضکہ ہر چیز پر گرد کی دبیز سی تہہ جم چکی تھی۔ کمرے کے باہر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ کسانوں کے چہرے گرد آلود تھے۔ جانور مٹی کے کھلونے بن چکے تھے۔ درختوں پر اور فصلوں پر مٹیالی رنگت نے اپنا تسلّط قائم کر لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ گرد و غبار نے تو فاصلے بھی بڑھا دئے تھے۔ رُوحانی بُعد کی بات نہیں کرتا، البتہ جسمانی بُعد تو یقیناً اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ایک گز کے فاصلے سے بھی کوئی گزرتا تو محسوس ہوتا گویا وہ سو گز کے فاصلے سے گزر گیا ہے۔

گرد کا یہ الف لیلوی ماحول کل شام تک بدستور قائم تھا۔ پھر نہ جانے کیسے آسمان کی گرد تیزی سے گہری ہونی شروع ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اس گہری گرد سے بادل کی تھکی تھکی گرج سنائی دینے لگی۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ گرمی ذرا زیادہ ہوئی اور ردِّ عمل کے طور پر اچانک کسی شام کو مغرب کی سمت سے گرجتا چنگھاڑتا اور شعلوں سے کھیلتا ہوا بادل کا فیلِ سیاہ فام اٹھا اور بساطِ فلک کو دیوانہ وار روندتا ہوا بڑھتا چلا گیا لیکن اگر آسمان اور زمین کے مابین پہلے ہی سے

گرد کی بادشاہت قائم ہو چکی ہو تو بادل کے مزاج میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ ایسے میں بادل کی پیش قدمی میں کسی بہادر سپاہی کی سی جرأت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی یلغار شبخون کا سا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال جب کل شام بوندا باندی شروع ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مینہ برس رہا ہے۔ بس یہی محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے موٹے موٹے ذرّات گر رہے ہیں۔

رات گئے تک بارش ہوتی رہی۔ ہوا خنک اور لطیف ہو گئی۔ چاروں طرف ایک سہانا سماں چھا گیا۔ گرمی سے جُھلسے ہوئے بدن ایک انوکھی فرحت محسوس کرنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ بڑے بوڑھوں کی حرکات و سکنات میں بھی تیزی و طراری کا احساس ہونے لگا۔ جیسے یک لخت سوئی ہوئی دنیا جاگ اُٹھی ہو۔ جیسے اس دنیا کے ہر ذی روح کو ایک نئی زندگی عطا ہو گئی ہو۔ اب خوشیوں کے پیمانے لبریز تھے ـــــ تاہم مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ اگلی صبح جب میں آنکھیں کھولوں گا تو میرے پیش نظر ایک ایسا ہوش رُبا منظر ہو گا جو میرے احساسات میں ایک انوکھی ہلچل پیدا کر دے گا اور میں فرطِ طرب سے بس مٹھیاں بھینچ کر رہ جاؤں گا۔

گرمی کا موسم ہو تو میں اپنے دیہاتی مکان کی چھت پر سوتا ہوں۔ کل رات جب بارش بند ہو گئی تو میں حسبِ معمول چھت پر آ کر سو گیا۔ اگر میں نیچے صحن میں سو جاتا تو شاید میں اس حیرت انگیز معجزے سے محروم رہ جاتا۔ بہرحال آج صبح جب میں اٹھا ہوں تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں اپنے ہی ملک کی سرزمین پر ہوں۔ اور جب مجھے یقین آیا تو میں آنکھیں ملتا ہوا تڑپ کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس مسافر کی طرح جو طویل تشنگی کے بعد اچانک کسی سرد و شیریں چشمے تک پہنچ جائے، اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیائے رنگ و بُو کو حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگا۔ عجیب منظر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا میں رات ہی رات میں گھٹن اور غبار کے خطّے سے نکل کر ایک ایسی نکھری سنوری ہوئی دنیا میں آ نکلا ہوں۔ جہاں ہر شے نے اپنی تابندگی اور نکھار سے فضا میں چکا چوند پیدا کر دی ہے ـــــ یہ کیسی دنیا تھی جو اس وقت میرے سامنے ڈوریوں

تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹیں اس گہری جھیل کی طرح تھیں جس پر ایک سحر طراز روشنی پھیل رہی ہو۔ فضا میں گرد کا نام و نشان تک نہیں تھا اور روشنی کا سیلاب تھا کہ ہر شے میں سرایت کرتا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بس پہلا احساس تو اس سحر طراز روشنی کے وجود کا تھا۔ جس کے پرتو سے آسمان، زمین، اڑتے ہوئے پرندے نسیمِ سحر کے جھونکوں پر سر دُھنتے ہوئے درخت، حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے کھیت اور اِن کھیتوں سے آگے ننگی سیاہ پہاڑیوں کا ایک بکھرا ہوا سلسلہ جگمگا اٹھا تھا ــــ درختوں کے پتے چمکتے ہوئے نگینوں کی طرح اپنے گرد و پیش کو روشن کر رہے تھے۔ آسمان پر اڑتی ہوئی چڑیوں کا ایک جُھرمٹ قوس قزح کی طرح رنگین ہو گیا تھا۔ اور مسجد کے قریب گاؤں کے کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی دیہاتی لڑکیوں کے رُخسار گلابی ہو رہے تھے۔ حتّٰی کہ مسجد کے مولوی کی چھدری ڈاڑھی بھی نورانی نظر آنے لگی تھی ــــ ایسی عجیب روشنی میں نے آج سے پہلے نہیں دیکھی تھی، جو اشیا کے ظاہر کو ہی منور نہیں کر رہی تھی بلکہ ان کے باطن تک میں سرایت کر گئی تھی۔ ایسا دلنواز منظر کیسے حقیقی ہو سکتا تھا؟ اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا حقیقت کہیں اور ہے۔ یہ ماحول تو صرف آئینہ ہے، جس میں حقیقت کا عکس پڑ رہا ہے۔

دوسرا احساس یہ تھا کہ ہر شے سمٹ کر میرے قریب آ گئی ہے۔ دُور اُفق کی پہاڑیاں جو بالعموم نظر بھی نہیں آتیں، آج اس قدر قریب آ چکی تھیں کہ میں ہاتھ بڑھا کر انھیں آسانی سے چھُو سکتا تھا۔ پھیلے ہوئے کھیتوں میں نہ صرف کپاس، جوار اور گنّے کی فصلوں کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ نظر آ رہے تھے۔ بلکہ ان کھیتوں کا ہر ہر پودا نکھر سنور کر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ سُورج ذرا اُفق سے بلند ہو گیا تھا۔ لیکن لاکھوں میلوں کے بُعد کے باوجود اس قدر قریب نظر آ رہا تھا کہ میں اگر ذرا بڑھ کر اسے پاؤں سے ایک ٹھوکر لگاتا تو شاید وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ لیکن اس شدید قرب کے احساس کے ساتھ کائنات کی وسعت کا احساس بھی ہم آہنگ تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا گویا میں خود اپنے محور سے دُور ہٹ رہا ہوں۔ گویا یہ اشیا میرے قریب نہیں آ رہی ہیں بلکہ میں خود پھیلتا ہوا ان سے ہم کنار ہو رہا ہوں۔ کوئی معجزہ یقیناً رونما ہو گیا تھا۔ باہر کی دنیا نے میرے اندر کی دنیا کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اب مجھے گھٹن اور قید کا احساس

نہیں تھا۔ اس کی جگہ آسودگی اور آزادی نے لے لی تھی۔

میں مندیر سے لگا بڑی دیر تک اپنی اس کائنات کو دیکھتا رہا جس نے نہا دھو کر سنگھار کر لیا تھا اور اب اپنی تمام تر جاذبیت اور حُسن کے ساتھ مجھے اپنے طلسم میں گرفتار کر رہی تھی اور پھر نہ جانے کیسے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیدا ہوا کہ میں تو اس مسحور کن صبح کا زندانی ہوں اور میری آزادی کی نوعیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مجھے ایک چھوٹے زندان سے ایک بڑے زندان میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اگرچہ اس وقت مجھے یہ نیا زندان کچھ ایسا راس آیا تھا کہ میں اس قید کو کسی بڑی سے بڑی آزادی پر ترجیح دینے کو تیار تھا، تاہم دل کے کسی نامعلوم گوشے میں یہ احساس ضرور دبکا پڑا تھا کہ شاید اس کائنات کی کوئی شے بھی پورے طور سے آزاد نہیں۔ میں اس زرنگار صبح کے حصار میں قید ہوں اور یہ زرنگار صبح وقت کے زنداں میں اسیر ہے اور پھر وقت خود وجود و عدم وجود کی سنگین دیواروں میں گھرا ہوا ہے۔ ـــــ مگر شاید حیات کے لئے قید ضروری ہے۔ پودے کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی ہو تو پھول نکالتا ہے، انسان ہوا کے سمندر میں ڈوبا رہے تو زندہ رہ سکتا ہے اور روح جسم کے زنداں میں قید رہے تو بالیدگی حاصل کر سکتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ قید بُری چیز ہے؟ مجھے اس زرنگار صبح کے زنداں میں تا دمِ زیست قید رکھو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے!

میں نیچے اترنے لگا، لیکن ایک لحظہ کے لئے رک گیا۔ میں سوچنے لگا: یہ میں نے کیا کہہ دیا ہے کہ میں اس زرنگار صبح کے زنداں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید رہ سکتا ہوں۔ کیا اس لئے کہ دس روز کی گرد آلود فضا کے بعد میں نے آج نکھری سنوری ہوئی دنیا دیکھی ہے؟ لیکن اگر ہر صبح اسی جاذبیت کے ساتھ میرے سامنے آتی رہی تو کیا میں اس سے بھی اکتا نہیں جاؤں گا۔ آج کتابِ زندگی کے سادہ اوراق الٹتے اُلٹتے ایک رنگین تصویر نے مجھے لحظہ بھر کے لئے ایک انوکھی مسرت سے ہم کنار کر دیا ہے لیکن اگر کتابِ زندگی کا ہر ورق رنگین ہو جاتے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی روز ایک سادہ تصویر بھی میرے احساسات میں ویسی ہی ہل چل پیدا کر دے؟

نہ جانے میں کتنی مدت سوچ کے اس نئے سمندر میں ہاتھ پیر مارتا رہتا، اگر نیچے صحن

سے دادی اماں کی گرجدار آواز میرے خیالات کا سلسلہ منقطع نہ کر دیتی۔ وہ کسی سے مجھے جگانے کو کہہ رہی تھیں۔

کچھ خوبصورتی کے بارے میں

پچھلے اتوار کا ذکر ہے۔ میں اپنے ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ یہ صاحب محکمۂ زراعت میں خاصے بڑے افسر ہیں اور زرعی امور میں ان کی رائے حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ زرعی اُمور سے میری اپنی واقفیت کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں۔ اس لئے کم از کم مجھے تو ان کی ہر رائے حرفِ آخر ہی نظر آتی ہے۔ یوں بھی کوئی شخص کپاس کی اقسام یا مونگ پھلی کی کاشت کے متعلق بات شروع ہی کرے تو مجھے نیند آنے لگتی ہے۔ اس لئے مکمل آرام حاصل کرنے کے لئے میں نے ان کی کسی رائے کو چیلنج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور سارا دن بڑے آرام سے ایک عالمِ وارفتگی و خود فراموشی یا بالفاظِ دیگر "غنودگی" میں مبتلا رہا۔ شام کو مجھے لاہور واپس آنا تھا۔ بدقسمتی سے رخصت ہونے سے ذرا پہلے مجھے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس مختصر سے قیام کا سارا لطف جاتا رہا۔

بات یہ ہوئی کہ مجھے تیاری کرتے دیکھ کر میرے کرم فرما نے میری توقعات کے بالکل برعکس یہ تجویز پیش کی کہ لاہور جانے سے پیشتر میں اُس ڈیری فارم کو بھی ایک نظر دیکھ لوں جو آج کل ان کی نگہداشت میں ہے اور جو ملک کے بہترین ڈیری فارموں میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی تجویز کے جواز میں انھوں نے یہ نکتہ پیش کیا کہ چونکہ مجھے زرعی امور سے خاطر خواہ دلچسپی ہے، لہٰذا

ڈیری فارم کے ملاحظہ سے میری معلومات میں بدرجۂ غایت اضافہ ہوگا۔

بادلِ نخواستہ مجھے اس تجویز سے متفق ہونا پڑا اور ہم چند لحظوں میں قریبی ڈیری فارم کے بڑے دروازے سے داخل ہوکر ایک وسیع احاطہ میں پہنچ گئے۔ یہ بھینسوں کا ڈیری فارم تھا اور شاید اس سے قبل میں نے ایسا کریہہ منظر زندگی بھر میں نہیں دیکھا تھا۔ گوبر اور پیشاب کی مستقل بُو میں قطار اندر قطار سیہ فام، موٹی اور بھدّی، خوفناک آنکھوں اور مڑے ہوئے سینگوں والی بھینسیں یوں کھڑی تھیں جیسے کسی ریگستان میں جلی ہوئی کرخت اور سیاہ پہاڑیاں۔ بھینسوں کی ان قطاروں میں سفید قمیص اور سفید جانگیہ پہنے بہت سے فربہ جسم نسیاہ فام گوالے محوِ گلگشت تھے۔ اور اپنی سست بدنما چال اور سیاہی مائل رنگت کے باعث بھینسوں ہی کے بھائی بند نظر آتے تھے۔ میرے کرم فرما مجھے ہر بھینس کے پاس لے جاتے، اس کا شجرہ نسب پڑھ کر سناتے، اس کی مختلف صفات پر ایک پُر مغز لیکچر دیتے اور پھر آگے کو چل دیتے۔ چلتے چلتے ہم لوگ ایک ایسی بھینس کے پاس پہنچے جو دوسری بھینسوں کی بہ نسبت زیادہ موٹی، زیادہ سیاہ فام اور کہیں زیادہ بدصورت تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے کرم فرما ٹھہر گئے۔ تبسم کی ایک درخشندہ لکیر ہولے ہولے اُن کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور دیکھتے دیکھتے ایک واضح ہنسی میں تبدیل ہوگئی۔ ان کی آنکھیں گہری ہوگئیں اور ان میں نشہ سا آگیا۔ سانس میں ناہمواری اور حرکات میں اضطراری سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اور انھوں نے لمبا سا سانس لے کر آخرِ کار جو جملہ کہا وہ مجھے شاید تادمِ زیست یاد رہے گا۔ فرمانے لگے:

"دیکھئے آغا صاحب! کس قدر خوبصورت بھینس ہے"!!

اس کے بعد کیا ہوا؟ میں وثوق کے ساتھ کچھ عرض کرنے سے قاصر ہوں۔ غالباً انھوں نے اس "حسین" بھینس کی تعریف میں کچھ اور کلمات بھی کہے ہوں گے اور اس کا مقابلہ شہرۂ آفاق تاریخی بھینسوں سے بھی کیا ہوگا۔ لیکن اُس وقت میری آنکھیں اور کان ماحول سے قطعاً منقطع ہوچکے تھے۔ میری نظروں کے سامنے ایک پردہ سا کھنچ گیا تھا اور اس پردے پر فلم کی متحرک تصاویر کی طرح کچھ مناظر اُبھر آئے تھے —— لیونارڈو کی مونالزا، الپس

کا پہاڑی منظر، بحرالکاہل کا کوئی خوابیدہ جزیرہ، حیران نظروں والا نرگس کا پھول سرد و شیریں چشمے پر جھکی ہوئی کوئی پہاڑی دوشیزہ اور ان حسین و دلفریب مناظر کے آخر میں ڈراؤنی آنکھوں اور مڑے ہوئے سینگوں والی ایک کالی بھینس جو مجھے سختی سے گھور رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو ——— "دیکھو! میں بھی اس فہرست میں شامل ہوں!"

میں فطرتاً خوبصورتی کا شیدائی ہوں (شاید ہم سب فطرتاً خوبصورتی کے شیدائی ہیں) ہر حسین منظر یا شے میرے احساسات میں ہلچل اور جذبات میں تموّج پیدا کر دیتی ہے۔ رُوح کے تار مرتعش ہو جاتے ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے قبل میری زندگی ادھوری اور ساکن تھی، اور اب اس لازوال منظر کے روبرو میں اپنی تکمیل کی طرف گامزن ہو گیا ہوں۔ ممکن ہے خوبصورتی کو سامنے پا کر آپ کا ردِّ عمل کچھ اور ہو۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل میں یہ خواہش بھڑک اٹھتی ہو کہ حُسن آپ کی گرفت میں آ جائے یا آپ حُسن میں ضم ہو جائیں لیکن خوبصورتی کے سامنے میرے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے ظاہر ہے کہ میں اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوا ہوں۔

خوبصورتی کی بات چھڑ گئی ہے تو داستان کے شہزادے کی طرح پہلے میری آنکھوں میں آنسو آئے ہیں اور پھر ہونٹوں پر تبسم لرزنے لگا ہے۔ اب اگر آپ کو اس پُراسرار صورتِ حال کی توضیح مطلوب ہو تو میں کہوں گا کہ میرے آنسو اس لئے اُبھرے ہیں کہ مجھے کائنات میں خوبصورت مظاہر کا اچھا خاصا قحط نظر آتا ہے اور میں مسکرایا اس لئے ہوں کہ ابھی ابھی ذہن کے "کنجِ ناموجود" سے چند ایک دلربا مناظر ابھر کر میری چشمِ تصوّر کے سامنے بکھر گئے ہیں۔ اور میں ان کی سُندرتا، ان کی لازوال پاکیزگی اور نکھری سنوری ہوئی دنیا میں یکسر کھو گیا ہوں ———

——— مثلاً آج سے کئی برس بیشتر جب میں پہلی مرتبہ کشمیر گیا تھا اور ایک صبح اچانک پہل گام جا پہنچا تھا تو میرے سامنے پہاڑ، وادی، جنگل اور ندیوں کا ملا جلا ایک ایسا دلربا منظر آ گیا تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ مجھے اُس وقت محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس عظیم اور حیرت انگیز منظر کے سامنے ہم سب بے جان کھلونے ہیں

—— حقیر اور بے کار سے مٹی کے تودے ہیں اور پھر جب میری نظریں آہستہ آہستہ وادی کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے اوپر اٹھتی برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں تک جا پہنچی تھیں، تو مجھے محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں کوئی بے جان کھلونا نہیں، بلکہ ایک زندۂ جاوید حقیقت ہوں اور یہ ہوش رُبا منظر محض اس لئے میرے پیشِ نظر ہے کہ میں اس پر قدم رکھ کر آکاش تک اونچا ہو جاؤں اور ستاروں سے ہم کلام ہونے لگوں —— اسی طرح جوہو کی وہ حسین شام بھی میرے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ جب لچکتی تھرکتی اور بل کھاتی ہوئی لہروں میں یکایک ایک تموّج سا پیدا ہو گیا تھا۔ شاید برسات کے کسی آوارہ بادل نے اِنھیں آہستگی سے چھیڑ دیا تھا۔ لہریں سرکش ہو گئیں تھیں۔ سمندر بپھر گیا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ساحل پر جھکے ہوئے ناریل کے درخت بھی موجوں کی زد میں آ گئے تھے۔ اس وقت جوہو کے پرستار نہ جانے کہاں بھاگ گئے تھے۔ ساحل بالکل سنسان ہو گیا تھا۔ صرف میں ایک جگہ اکڑوں بیٹھا بدمزاج سمندر کا رقص دیکھتا رہا تھا۔ اس ایک لمحۂ تابناک میں برسرِ پیکار عناصر نے مجھے زندگی کی ہاؤ ہو، بے قراری و شوریدہ سری سے اس قدر دور کر دیا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا جیسے وقت کی پرواز تک رک گئی ہے اور میں مسرّت و بہجت کی ایک دلنواز کیفیت میں تحلیل ہوتا جا رہا ہوں۔

یہ اور اسی قسم کے کچھ اور حسین مناظر میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور میں جب چاہوں قندِ مکرر کا لطف لینے کے لئے ان کا پھر سے نظارہ کر سکتا ہوں۔ البتہ ایک منظر ان سب مناظر سے زیادہ دلکش، زیادہ دلفریب اور کہیں زیادہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اور اس نے ابھی ابھی وقت کی تاریکیوں سے اُبھر کر میرے نہاں خانۂ دل کو منوّر کر دیا ہے۔ ۱۹۴۵ء کا یا شاید ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ بہرحال یہ واقعہ اگر اس سے دس برس پیشتر کا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی واقعہ جب وجود میں آنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر وہ شاید تاریخ اور سن کی پروا کئے بغیر ہی آدھمکتا ہے۔ آئن سٹائن کا تو یہاں تک خیال ہے کہ وقت بذاتِ خود کوئی شے نہیں۔ یہ تو ایک کیفیت ہے جس کی حدود واقعات ہی سے متعین ہوتی ہیں۔ دیہاتی لوگ اس سلسلے میں کچھ زیادہ حقیقت پسند ہیں۔ ان کے تصورات سن اور تاریخ سے ملوّث

نہیں ہونے پاتے۔ ان کی جگہ قحط، وبا، سیلاب یا زلزلہ کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے وقت کا تعیّن کر لیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ واقعہ مجھے ڈلہوزی میں پیش آیا تھا۔ میں ان دنوں اپنے ایک دوست ـــــ "ن" کے ساتھ اَپر بکروٹا کی ایک کٹیا میں مقیم تھا۔ ہمارا روز کا معمول تھا کہ جب ڈوبتا ہوا سورج سنہری بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہوتا۔ ہم اپنی کٹیا سے نکلتے اور اپر بکروٹا کی کمر سے لپٹی ہوئی ایک خوبصورت سڑک کا پورا چکّر لگاتے۔ اس سڑک کا کچھ حصّہ تو سیّاحوں کے قہقہوں سے گونج رہا ہوتا اور باقی حصّے پر گھرے جنگل کی خاموشی مسلّط رہتی۔ ایک شام جب میں اور "ن" حسبِ معمول سڑک کے اس "جنگلی" حصّے سے گزر رہے تھے جہاں کسی ذی روح سے ملاقات کا خدشہ تک نہیں تھا، ہمیں سڑک کے کنارے پتّھر پر بیٹھی ہوئی ایک سیّاح عورت دکھائی دی۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس جیسی حسین عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی تو آپ بے شک مجھے ٹوک دیجئے اور کہئے کہ "آپ نے حسین عورتیں دیکھی ہی کب ہیں"۔ لیکن جب ہم اس کے قریب سے گزرنے لگے تو اس نے اپنی جھکی جھکی پلکوں کو اٹھا کر ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور اگر میں یہ کہوں کہ ایسی حسین و دلفریب آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں تو آپ بے شک پورے جوش اور اعتماد کے ساتھ مجھے ٹوکیے اور کہئے: "آپ نے حسین آنکھیں دیکھی ہی کب ہیں" ـــــ لیکن میں اسی شدّت سے اپنے دعوے کو دہراتا چلا جاؤں گا۔ شاید الفاظ اس کیفیت کو بیان نہ کر سکیں، جو اُن پُراسرار نشیلی آنکھوں میں موجود تھی۔ بس لحظہ بھر کے لئے یہ محسوس ہوا تھا۔ جیسے ان آنکھوں سے کوئی برقی رَو نکلی اور جنگلوں، پہاڑوں اور وادیوں پر سے گزرتی، کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر رہ گئی۔ یہی اتھاہ گہرائی ان آنکھوں میں بھی تھی۔ اور ساتھ ہی وہ نشیلی سی کیفیت جیسے زندگی کا سارا سکھ، سارا چین اِن دو آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ اس وقت مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے یکلخت خاموش ہو گئے تھے اور کتنا ہی راستہ اسی خاموشی میں بڑھتے چلے گئے تھے۔

مجھے حُسن کی طلسماتی کیفیات سے انکار نہیں اور مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ خوبصورتی چند ایسے نادر اور لطیف خطوں، دائروں اور رنگوں پر مشتمل ہے جو ہر ذی روح کے احساسات میں

تموّج پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ روح فرسا احساس بھی ہمیشہ سے ہے کہ کائنات میں حسین اشیا کی فراوانی نہیں۔ چنانچہ میں نے خوبصورت مناظر اور حسین کیفیات کی تلاش میں جب کبھی اپنے ماضی کی راکھ کو کریدا ہے تو مجھے محض چند ایک حسین مناظر ہی دکھائی دئے ہیں۔ البتہ بدصورتی کے مظاہر کی تلاش میں نکلا ہوں۔ تو ڈیری فارم کی بھینسوں کی طرح مجھے سینکڑوں ہیولے قطار اندر قطار کھڑے نظر آتے ہیں ——— لیکن عجیب بات ہے کہ پچھلے اتوار کے حادثے کے بعد میں اپنے خیالات و احساسات کا از سر نو جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اب پہلی بار ایمرسن کا قول کہ ہم چاروں طرف خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن اسے دیکھنے کے لئے ہمارے پاس آنکھیں نہیں، اپنی پوری صداقت کے ساتھ ابھر کر میرے سامنے آگیا ہے اور میں حیران ہو گیا ہوں کہ آج سے پہلے خوبصورتی کا کتنا محدود تصوّر میرے ذہن کا اثاثہ تھا اور میں نے اپنی تنگ و تاز کو کس بے دردی سے محض چند مناظر تک محدود کر لیا تھا۔ چنانچہ اب مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ایسی بہت سی اشیا یا کیفیات بھی ہیں جن کی خوبصورتی کا احساس مجھے آج سے قبل ہرگز نہیں تھا ——— اور یہ احساس اس لئے نہیں تھا کہ میری آنکھیں ان کا ہر روز نظارہ کرتے ہوئے ان سے اس قدر مانوس ہو چکی تھیں کہ میرے لئے ان میں کوئی جاذبیت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ شاید بچّے کی مسرّت کا راز یہ ہے کہ اسے ہر شے نئی اور انوکھی نظر آتی ہے اور اس کے لئے ایک ریچھ کا بچّہ یا مرغی کا پَر اتنا ہی حسین ہے جتنا میرے لئے سرکش لہروں کا رقص یا ریسلی آنکھوں کا جادو ——— بہرحال اب مجھے محسوس ہونے لگا ہے۔ جیسے خوبصورتی اشیا میں ہی نہیں، اس زاویہ نگاہ میں بھی ہے جس سے اشیا کا ادراک ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر میں ہر شے کو اس انداز سے دیکھوں گویا اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں تو ممکن ہے مجھے اس کی سادگی میں بھی ایک جہانِ رنگ و بو نظر آجائے ——— پس آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اب مجھے کسی ڈیری فارم میں جانے کا اتفاق ہوا یا ویسے ہی سرِ راہ کوئی بھینس نظر آگئی تو میں ناک بھوں چڑھانے کی بجائے چند لحظوں کے لئے اپنے کرم فرما کا زاویہ نگاہ عاریتاً لے لوں گا اور بھینس کے "حسنِ لازوال" میں کھو جاؤں گا۔

سُست روی

پُورے سات روز شہر کے شور و شر اور اس کی ہنگامہ خیزیوں میں بسر کرنے کے بعد میں ابھی ابھی اس ننھے سے گاؤں میں پہنچا ہوں۔ شام کا وقت ہے۔ دن کی روشنی دھیرے دھیرے ماند پڑتی جا رہی ہے اور شام کے دھندلکے کمال آہستگی سے اُفقِ مشرق سے اٹھتے خراماں خراماں آسمان کی وسعتوں میں پھیل رہے ہیں۔ ان دُھندلکوں کی ہمراہی میں کچھ تھکے تھکے سُست رو پرندے نجانے کب سے بساطِ فلک کو پار کرنے کی سعیِ لاحاصل میں مبتلا ہیں۔ ان کی منزل درختوں کا وہ تاریک سا جھنڈ ہے جو گاؤں کے آخری کنارے پر ایک سیاہ دیوار کی طرح کھڑا ہے اس دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤں کی ایک کچّی سڑک ہے اور اس سڑک پر ایک بیل گاڑی ہلکی ہلکی موسیقی کو جنم دیتی اس قدر آہستگی سے رواں ہے کہ گمان ہوتا ہے جیسے اس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ گاڑی بان نیم غنودگی کے عالم میں بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ بیل گاڑی میں نیم دراز، صدیوں پرانا کوئی گیت گنگنا رہا ہے۔ چاروں طرف ایک گہرا سنّاٹا ہے، جسے لرزتے ہوئے گیت نے اور بھی گہرا کر دیا ہے —— شہر کی تیز رفتار زندگی کے بعد دھیرے دھیرے بجھتی ہوئی یہ شام، یہ سُست رو پرندے۔ یہ تھکا ہوا گاؤں، یہ بیل گاڑی اور اس کا گاڑی بان —— مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چلتی ہوئی فلم یکلخت

سُست رو ہو گئی ہے اور ہر شے مضحکہ خیز "آہستگی" کا مظاہرہ کرنے لگی ہے۔

ممکن ہے آپ سوچیں کہ میں گاؤں کی آہستہ خرام زندگی کی مذمت کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں! دراصل میں نے تو محض اس احساس کو بیان کیا ہے، جو شہر کے شور و شر سے گاؤں کی خاموش فضا میں یکلخت وارد ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ احساس عالم گیر ہے اور صداقت پر مبنی۔ تاہم جب میں گاؤں کی خاموش فضا سے شہر کے ہنگامہ خیز ماحول میں واپس جاؤں گا اور مجھے زندگی میں تحرّک اور تموّج کا احساس ہو گا تو یہ احساس بھی عالمگیر ہو گا اور صداقت پر مبنی ——

پھر بھی شہر کی ہنگامہ خیزی، شوریدہ سری اور تیز رفتاری میں اس احساس کی نمود کہ وقت کی رفتار تیز ہو گئی ہے، محض ایک واہمہ ہے۔ وقت تو ایک خاص رفتار سے رواں دواں ہے نہ یہ تیز ہوتا ہے، نہ مدھم۔ البتّہ شہر کے ماحول میں خود آپ وقت کی نسبت سے تیز ہو جاتے ہیں۔ اور اس تیزی کے ساتھ آپ کے دل کی دھڑکن اور اعضا کی حرکت بھی تیز ہو جاتی ہے۔

لیکن کیا اس کے ساتھ ساتھ وقت کا رتھ بھی تیز ہوا ہے؟ ہرگز نہیں! وقت تو اسی طرح گھڑی کی سوئیوں میں جکڑا ہوا ہے یا طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کی طلائی زنجیروں میں قید ہے۔ پھر کیا شہر کی رفتار کا احساس محض ایک واہمہ نہیں؟

لیکن میں گاؤں میں وقت کی سُست رفتاری کو واہمہ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ گاؤں کی رفتار خود فطرت کی رفتار ہے —— کبھی آپ نے غور فرمایا کہ فطرت کی رفتار کیا ہے؟ —— فطرت کی رفتار کا اندازہ کرنے کے لئے وہ خوبصورت لیکن ساکت و جامد عمارت ہرگز مفید نہیں جو قوتِ نمو سے محروم، تحرّک اور لچک سے ناآشنا، محض مٹی کا ایک ڈھیر ہے اور بس! اسی طرح وہ بڑی سی لوہے کی مشین جو میرے یا آپ کے اشارے پر نگلنے اور اگلنے کے فرائض سرانجام دیتی ہے، درحقیقت محض دھات کا ایک بے جان ٹکڑا ہی تو ہے۔ اس کے برعکس گاؤں کے اس خاموش اور پُرسکون ماحول کا ہر ذی روح بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ یہاں ہر شے کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ ذرا

اس پودے پر نگاہ ڈالئے! کئی ماہ کی بات ہے کہ یہ پودا، زمین کی سطح کے نیچے اپنے بیج کے خول کو توڑ کر باہر نکلا تھا۔ پھر اس نے کمال آہستگی سے مٹی میں سے اپنا سر باہر نکالا اور بڑے مزے سے آہستہ آہستہ بلند ہوتا رہا۔ اس میں وہ قوتِ نمو تھی جو زندگی کا امتیازی وصف ہے اور اسی قوتِ نمو کے بل بوتے پر اس نے تخلیق کے جملہ مراحل ایک صبر آزما آہستگی سے طے کئے۔ یہ نکلا، بڑھا، پھیلا، پھول نکالے، بیج بنائے اور اپنی ساری انفرادیت ساری قوتِ نمو نئے بیج کے خول میں داخل کر کے جس آہستگی سے آیا تھا، اسی آہستگی سے رخصت ہو گیا۔ پھر مر گیا۔ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا، کوئی لہر نہیں مچلی، کوئی طوفان نہیں آیا۔ مسرت، غم، تنہائی کوئی بات بھی تو اس پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ تاہم یہ ننھّا سا، نازک سا خوبصورت پودا فطرت کا صحیح نمائندہ تھا۔ اس کی رفتار کا مظہر تھا ـــــ رفتار جو قوتِ بالیدگی اور حدتِ نمو کی رفتار ہے۔ یہ رفتار میل و فرسنگ کے تابع نہیں بلکہ کائنات کے مخصوص تحرّک کی پیداوار ہے۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب اور موسموں کے ادل بدل سے اس رفتار کی تشکیل ہوئی ہے ـــــ میں جب اپنے دیہاتی باغیچے میں گھومتا ہوں یا گیہوں کے کھیت میں گھٹنوں تک دھنس جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنی جنم بھومی، اپنی مادرِ وطن کی نرم و گداز آغوش میں واپس آ گیا ہوں اور میری رفتار جو شہر کے تحرّک اور تموّج اور افکار کی تندی اور وحشت کے باعث تیز ہو گئی تھی، پھر سے مدھم ہو کر فطرت کی مخصوص رفتار سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ اور میرا دل فطرت کی موہوم دھڑکن کا ہم نوا بن کر آہستہ خرام اور مائل بہ سکون ہو گیا ہے۔ فطرت کا یہ تسکین دہ احساس اس کی متاعِ گراں بہا ہے۔ شاعر لوگ بالکل سچے ہیں۔ فطرت کی بے کنار وسعت، اس کی آہستہ خرامی اور خنک مزاجی خود شاعر کے مطمحِ نظر میں وسعت اور اس کے جذباتی ابال میں سُبک روی پیدا کر دیتی ہے۔ یعنی فطرت شاعر کے دامن کو پکڑ کر اسے ٹھہرا لیتی ہے اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اس انداز سے چلتی ہے کہ شاعر کے قدم از خود فطرت کے قدموں سے ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں فطرت کے حسنِ لازوال کا مقصد بھی شاید یہی ہے یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خود شاعر کا سراپا دراصل فطرت کا ایک جزو ہے ـــــ جزو جو اپنی روشنیٔ طبع

کے تحت بے قراری اور شوریدہ سری میں مبتلا ہو کر "کُل" سے جُدا ہو گیا تھا اور آج واپس اپنے گھر پہنچا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے میں شہر کے تھکا دینے والے ماحول سے ابھی ابھی اس خاموش سے گاؤں میں وارد ہوا ہوں۔

لیکن المیّہ کا پہلو محض یہی نہیں کہ بالعموم انسان کی رفتار فطرت کی مخصوص رفتار سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اس المیّے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات یہ رفتار فطرت سے کم رہ جاتی ہے ـــــ عجیب بات ہے کہ انبوہ اور ہجوم سے رفتار کو مہمیز لگتی ہے۔ مثلاً کوئی نیم وحشی ناچ ہو یا بال روم کا رقص جیسے جیسے قدموں کی تعداد میں اضافہ ہو گا، رقص کا تموّج بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ لفٹ رائٹ کی تیزی بھی اسی نفسیاتی کیفیت کے تابع ہے اور ہجوم کی تخریبی کارروائی بھی شاید بڑھتے تھرکتے ہوئے لاتعداد قدموں ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ جن کی زندگی کی گاڑی ضرورت سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے منشیات کو بطورِ "بریک" استعمال کرتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر بیشتر اوقات اس قدر سُست رو ہو جاتے ہیں کہ فطرت کے قدموں سے بھی اپنے قدم نہیں ملا سکتے ـــ دونوں باتیں غلط ہیں۔ میری طرف دیکھئے۔ میں نے تیز رفتاری کا کیسا عجیب علاج ڈھونڈ لیا ہے۔ جب انبوہ اور ہجوم کے اثرات بڑھ جاتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ شہر کے ماحول میں میری ذہنی اور جسمانی رفتار ضرورت سے زیادہ تیز ہو گئی ہے تو کسی صُبح اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ کئے بغیر چپ چاپ بس سٹینڈ کا رُخ کرتا ہوں ـــ بس چند گھنٹوں کے لئے مجھے اپنے دل میں جگہ دیتی ہے اور پھر ایک سو میل دور کسی ویران سے مقام تک لے جا کر کسی اٹھارھویں صدی کی طرز کی ٹم ٹم کے حوالے کر دیتی ہے۔ ٹم ٹم کا گھوڑا دو تین میل کے بعد دم توڑ دیتا ہے اور میں بیل گاڑی کے سپرد کر دیا جاتا ہوں۔ بیل گاڑی گاؤں کی کچّی سڑک پر اس آہستگی سے چلتی ہے کہ گمان ہوتا ہے گویا اس کی کوئی منزل ہی نہیں۔ میں کوئی صدیوں پُرانا گیت گنگنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ شام کا وقت ہے۔ کچھ تھکے تھکے سُست رو پرندے نجانے کب سے بساطِ فلک کو پار کرنے کی سعیٔ دوام میں مبتلا ہیں۔ تنہائی اور اداسی میں لپٹے ہوئے گاؤں پر ہولے ہولے سرمئی دھندلکے

مسلّط ہو رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے گویا ایک طویل مدّت کے بعد اپنے مرکز کی طرف لوٹ رہا ہوں ——— مصنوعی وقت کے بندھنوں سے آزاد ہو کر کسی شانگری لا میں پہنچ گیا ہوں۔

موڑ

کبھی آپ کسی موڑ پر لحظہ بھر کے لئے رکے ہیں؟ موڑ کی نوعیت کو چھوڑتے!!!
بس کوئی سا موڑ ہو ——— سڑک کا موڑ! ندی کا موڑ یا پھر زندگی کا موڑ! ——— غالباً نہیں! وجہ اس کی یہ ہے کہ جب آپ ایک خاص رفتار سے گرمِ سفر ہوں تو قدرتی طور پر موڑ کے قریب پہنچتے ہی آپ کی رفتار ذرا سی مدھم ہو کر یک لخت تیز ہو جاتی ہے اور آپ ایک لمحہ خود فراموشی میں موڑ کے نازک مقام کو پار کر جاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے: ؎

میکدے کے موڑ پر رُکتی ہوئی!
مدتوں کی تشنگی تھی، مَیں نہ تھا!

بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہر رکاوٹ رفتار کو بڑھاتی ہے اور سڑک، ندی یا زندگی کے لئے موڑ ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اور اسی میں موڑ کی جاذبیت بھی ہے۔ سیدھی سڑک تو ایک لاش کی طرح ہے ——— لاش جو ازل اور ابد کے درمیان بے حس و حرکت پڑی ہے۔ پہلے سنگِ میل سے آخری سنگِ میل تک سیدھی سڑک ایک سپاٹ، بے رنگ اور بے جان سی شے ہے جس پر سفر کرنیوالا خود بھی اکتاہٹ اور بدمزگی کا شکار ہو کر دم توڑ دیتا ہے لیکن جونہی یہ سڑک ہر سنگِ میل پر مڑنا شروع

ہوتی ہے تو گویا اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ سڑک کے لئے ہر موڑ ایک دھڑکن ہے اور دھڑکنوں کا یہ سلسلہ جس قدر تیز اور پائدار ہوگا۔ سڑک اسی قدر جاندار، جاذبِ نظر اور جیتی جاگتی نظر آئے گی۔ ندی کے حسن کا راز بھی اسی میں ہے اور زندگی ——— زندگی میں اگر کوئی موڑ نہ ہو تو کس کام کی ہے!

موڑ کے اس انوکھے پہلو کی اہمیت کا احساس مجھے کب اور کن حالات میں ہوا ——— یہ بھی ایک داستان ہے۔ میں تازہ تازہ کالج کے خول سے برآمد ہوا تھا۔ دل میں ہزاروں ارادے اور ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔ بس یہی جی چاہتا تھا کسی صبا رفتار اُڑن کھٹولے پر نیم دراز مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب کو اڑتا پھروں، مجھے کوئی روکنے والا نہ ہو، کوئی راستہ دکھانے والا بھی نہ ہو۔ گرم گرم لہو کی بات تھی۔ ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ بقولِ انشؔا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور نکہتِ بادِ بہاری کی چھیڑ سے بھی بیزار ہیں۔ بہرحال سیر و سیاحت کے اس دور میں ایک صبح ایسی بھی آئی کہ میں وادی کشمیر میں مٹن کے پُرفضا مقام پر بڑے بڑے چناروں کے سائے میں سبزے پر لیٹا، کئی روز کی آوارہ گردی سے اکتایا ہوا ایک ٹھنڈی میٹھی نیند سو جانا چاہتا تھا، لیکن لہو کی موج کو قرار کہاں؟ اور پھر وہ دن ہی ایسے تھے! میں نے سنا کوئی سیاح اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ——— "یار! پہلگام یہاں سے قریب ہے۔ چلو بس پکڑتے ہیں۔" مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ خوشی اس لئے کہ پہلگام قریب تھا۔ دکھ اس لئے کہ یہ لوگ بس کے سہارے کے محتاج تھے ایک لحظہ کے لئے مجھے ان کی کاہلی، عافیت کوشی اور آرام طلبی پر غصّہ بھی آیا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یہ جذبہ ایک اضطراری کیفیت میں بدل گیا اور میں غیر ارادی طور پر اپنے تھیلے اور چھڑی کو سنبھالتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے بعد میں پہلگام جانے والی سڑک پر ایک مستعد سپاہی کی طرح اڑا چلا جا رہا تھا۔

سفر کی پہلی منزل تو گویا پلک جھپکنے میں طے ہو گئی اور میں دیکھتے ہی دیکھتے تنگ ہوتی ہوئی وادی کے درمیان تک پہنچ گیا۔ اب اعضا کچھ بوجھل ہونے لگے اور تھکاوٹ کی ایک ہلکی سی لہر پاؤں سے اٹھتی ہوئی جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیلنے لگی اور پھر یہ لہر بھی بوجھل ہو گئی۔

اور میں غیر ارادی طور پر سستانے کے لئے کوئی موزوں مقام تلاش کرنے لگا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ ایک تیز رفتار پتھروں سے سر پٹختی ہوئی ندی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی ہوئی کولتار کی سڑک بلندیوں کی طرف اُٹھتی چلی جارہی ہے۔ اور اس کے ساتھ سارے کا سارا منظر بھی گویا ایڑیاں اٹھا کر اُونچا اٹھ رہا ہے۔ سربفلک پہاڑ درختوں سے لدے کھڑے ہیں اور ان کے اوپر ننھے ننھے ابر پارے محو خرام ہیں —— اور تب مجھے اپنے سامنے ایک موڑ پر، بڑا سا ایک پتھر تخت کی طرح بچھا ہوا نظر آیا گویا کسی پُراسرار قوت نے محض میری خاطر اسے وہاں نصب کر رکھا تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس پتھر تک جا پہنچا۔ اور تھیلے اور چھڑی سے خود کو آزاد کرتا ہوا پتھر کے اس تخت پر بیٹھ گیا۔ چند لحظوں کے لئے میں نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور پھر جو آنکھیں کھول کر میں نے چاروں طرف دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ میرے بائیں طرف وہ تمام منظر تھا۔ جس سے میں ابھی ابھی گزر کر آیا تھا اور دائیں طرف نجانے کہاں سے ایک نیا اور پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت منظر اُبھر آیا تھا اور ایک نگینے کی طرح شفاف، چمکیلا اور دُھلا دُھلایا دکھائی دے رہا تھا ——

اور میں خود اُس سنگم پر بیٹھا جسے اصطلاح عام میں 'موڑ' کہتے ہیں۔ ان دونوں مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس وقت پہلی بار مجھے موڑ کی اہمیت کا احساس ہوا اور میں مسرت اور انکشاف کی لازوال کیفیات سے چشم زدن میں گزرتا چلا گیا۔

اور اب میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں مٹن سے بس پکڑ لیتا یا اس پتھر سے دس قدم پیچھے ہی کسی درخت کے سایے میں ستانے کو رک جاتا تو انکشاف وعرفان کے اس لمحے کے لئے نجانے مجھے کتنا عرصہ اور انتظار کرنا پڑتا۔ اس روز پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ ہر موڑ ایک سنگم ہے۔ سنگم جس کے دونوں طرف محض دو چار گام کے فاصلے پہ صرف ایک دنیا، ایک کیفیت اور ایک رنگ باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن اس سنگم پر دو دنیائیں، دو کیفیتیں اور دو رنگ لحظہ بھر کے لئے ملتے ہیں اور آپ دونوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ آپ کی بائیں طرف وہ سارا ڈوبتا گرتا ہوا منظر ہے جس سے آپ ابھی ابھی نمودار ہوتے ہیں۔ یہ آپ کا ماضی ہے! دائیں طرف ایک نئی دنیا، ایک نئے منظر نے اپنے آغوش کو وا کر دیا ہے اور آپ کو اپنے بازوں

میں سمیٹنے کے لئے بیتاب ہے۔ یہ آپ کا مستقبل ہے! لیکن آپ موڑ کے سنگم پر بیٹھے، ان دونوں سے بے نیاز ہیں۔ آپ ماضی کی ڈوبتی ہوئی نبض کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ اور مستقبل کی تیز ہوئی دھڑکن کو بھی اور آپ کو لحظہ بھر کے لئے یہ صلاحیت بھی حاصل ہے کہ دونوں کا جائزہ لے سکیں۔ یہ لمحہ بڑا ناپائدار ہے۔ ابھی آپ اپنی چھڑی اٹھائیں گے، تھیلے کو بازو سے لٹکائیں گے اور مستقبل کی پگڈنڈی پر قدم رکھتے، بڑھتے چلے جائیں گے۔ پھر ماضی پر صدیوں کی گرد جم جائے گی۔ اور گزرا ہوا منظر کبھی آپ کو اپنی جھلک نہیں دکھائے گا۔ لیکن اس پتھر پر بیٹھ کر، اس سنگم پر لحظہ بھر کے لیے رک کر آپ نے ایک انوکھے ذائقے سے خود کو آشنا کیا ہے اور وقت کے کبھی نہ رُکنے والے کارواں سے اپنا دامن جھٹک کر علیٰحدہ کر لیا ہے۔ یہ لمحہ! آزادی کا یہ قیمتی لمحہ ہزار ناپائدار سہی، اس کی عظمت سے انکار مشکل ہے۔

لیکن ہر موڑ پر پتھر نصب نہیں ہوتا بلکہ موڑ پر تو سرے سے کوئی نشان موجود ہی نہیں ہوتا یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ پہلگام کے راستے میں نادیدہ قوتوں کا لڑھکایا ہوا پتھر ایک ایسے مقام پر آکر رک گیا تھا جو ایک قدرتی موڑ تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ موڑ بغیر اطلاع دیئے شروع ہوتا اور بغیر آپ سے مشورہ کئے ختم ہو جاتا ہے۔ اور آپ اپنے افکار میں غلطاں یوں بڑھے چلے جاتے ہیں گویا موڑ کے وجود کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں تھی۔ بیشتر اوقات تو شاید آپ کو موڑ کے وجود کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اچھا اگر یہ بات نہیں تو بتائیے، جب آپ بچپن اور جوانی کے سنگم پر پہنچے تھے تو آپ کو اس موڑ کا احساس ہوا تھا؟ پھر جب عہدِ شباب اور عہدِ پیری نے ایک دوسرے کو گلے لگایا تھا آپ اس وقت کہاں تھے؟ ——— وہ لمحہ، وہ مقام، وہ سنگم جس کے لبوں پر زہر بھی تھا اور امرت بھی ——— وہ پتھر جس کا سہارا لے کر آپ وقت کی گزران کا احساس کر سکتے تھے، آپ کو کبھی نظر نہ آیا۔ ایک روز آپ بچہ تھے، دوسرے روز جوان ہو گئے تھے۔ ایک روز جوان تھے، دوسرے روز بوڑھے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ لمحہ جو زندگی کی تقسیم سے ماورا تھا، وہ موڑ جہاں سے آپ کائنات کی حقیقت پر ایک گہری نظر ڈال سکتے تھے، آپ کے ہاتھوں سے ہر بار پھسل گیا اور اس خوبصورتی سے پھسل گیا کہ آپ کو

احساسِ زیاں تک نہ ہو سکا۔

شاید قدرت کو یہ منظور ہی نہیں کہ ہم کسی موڑ پر رکیں۔ شاید اسی لئے موڑ پر رفتار تیز ہو جاتی ہے!

ریل کا سفر

ریل میں سفر کرنے کے یوں تو بہت سے فائدے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس سفر کی ترغیب دلانے والے اکثر و بیشتر جسمانی آسائشوں کے حصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتے ہیں جو پوری سیٹ پر دراز، سر کے نیچے تکیہ اور پاؤں کے نیچے تہہ کیا ہوا بستر رکھے ایک شانِ دلربائی کے ساتھ کتاب پڑھنے میں منہمک ہوتا ہے۔ آخر میں یہ لوگ اس شخص کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں آسائش کا اس سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ تصوّر ناممکن ہے۔

بادی النظر میں تو مجھے اس شخص کا قول قابلِ قبول ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یاد آتا ہے کہ ریل میں سفر کرتے وقت اوّل تو ساری سیٹ پر دراز ہونے کی سعادت ہی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اور اگر نصیب ہو بھی جائے تو چلتی گاڑی میں کتاب پڑھنا اس سے مشکل تر مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں بمشکل اپنی انگلی کی مدد سے آدھی سطر پڑھنے میں کامیابی حاصل کرتا ہوں کہ ریل کے ایک ہی ہچکولے سے میری انگلی کسی اور سطر پر جا ٹکتی ہے۔ کچھ وقت اصل سطر کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور جب بہ خرابی بسیار مجھے اس سطر تک رسائی

حاصل ہوتی ہے تو ریل کا تازہ جھٹکا انگلی کو پھر کسی دوسری سطر تک پہنچا دیتا ہے۔ کتاب تو درکنار مجھے کبھی چلتی ریل میں ایک گلاس پانی پینے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ویسے کوشش میں نے کئی بار کی ہے اور دوسرے مسافروں کی طنز آلود آنکھوں کے باوجود کنگ بروس اور مکڑی کی روایات کو برقرار رکھتا آیا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے گلاس اور ہونٹ میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکا۔ تصادم البتہ کئی بار ہوا ہے۔

جسمانی آسائش سے قطع نظر ریل کے سفر کے بعض دوسرے پہلو یقیناً بڑے جاذبِ نظر اور خیال انگیز ہیں اور میں دراصل انہی پہلوؤں کے پیشِ نظر ریل کے سفر کی پرزور سفارش کرنے لگا ہوں۔ ان میں سے ایک پہلو تو یہ ہے کہ ریل کا سفر انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ کے بعض نہایت قیمتی مواقع فراہم کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنے گھر، محلہ، شہر یا گاؤں میں اقامت پذیر رہتے ہیں، ہماری بہت سی جبلّتوں پر رسم و رواج اور روایت و اخلاق کے بھاری پردے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہم اپنے اس زندان سے نکل کر ریل میں سوار ہو جاتے ہیں اور گھر، محلہ، شہر یا گاؤں کے ساتھ ہمارے روابط کچھ مدت کے لئے ٹوٹ جاتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمارے فطری اوصاف یا برائیاں اُبھر کر نمایاں ہو جاتی ہیں چنانچہ میں نے اکثر اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ ریل کے سفر کے دوران میں یا تو لوگ حد سے زیادہ ملنسار اور بامروّت نظر آتے ہیں۔ اور یا حد سے زیادہ چڑچڑے اور بدمزاج دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح فطری طور پر خاموش لوگ ریل کے ڈبے میں اس درجہ خاموش ہو جاتے ہیں کہ ان پر رحم آنے لگتا ہے اور فطرتاً باتونی لوگ کچھ اتنے باتونی ہو جاتے ہیں کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے یوں تو ریل کے سفر میں انسانی فطرت کے اس دلچسپ مطالعہ کے بہت سے مواقع ملے ہیں لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پچھلے موسم سرما کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا اور میں لاہور جانے کے لئے ایک غیر معروف اسٹیشن سے انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہوا تھا۔ اتفاق سے ڈبے میں ایک سیٹ خالی تھی اور میں جلدی سے بستر بچھا کر اس پر دراز ہو گیا۔ اور دراز ہوتے ہی سو گیا۔ نہ جانے میں کتنی مدت سویا رہا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی منوں بھاری چیز میری ٹانگوں پر آ گری ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی ٹانگیں

سمیٹ لیں اور منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو ایک صاحب نظر آئے جو میری سیٹ کے آخری کونے ـــــ میں بڑے اطمینان سے براجمان ہو چکے تھے۔ خیر میں دوبارہ سو گیا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھے آہستہ آہستہ اوپر کو دھکیل رہی ہے۔ اس بار میں نے منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہی صاحب اب آدھی سیٹ پر قبضہ کر چکے تھے اور بتدریج اپنی مملکت کی حدود کو بڑھا رہے تھے۔ اب میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں کچھ اور سمٹ جاتا۔ چنانچہ میں کچھ اور سمٹ گیا۔ وہ کچھ اور پھیل گئے۔ میں اٹھ بیٹھ گیا۔ وہ لیٹ گئے اور بڑی بے تکلفی سے خراٹے لینے لگے۔ اب اتفاق دیکھئے کہ میرے سامنے والی سیٹ پر دوسرے مسافروں کے علاوہ ایک انتہائی مریل قسم کے صاحب تشریف فرما تھے اور قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ سارا ڈراما انتہائی غور سے ملاحظہ فرمایا ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان کے چہرے سے استہزائیہ تبسم کی بجائے خشونت مترشح تھی۔ جیسے وہ میرے بزدلانہ فعل کو انتہائی حقارت سے دیکھ رہے ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے اپنی نالائقی پر اس قدر شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے اپنی گردن جھکالی اور ان سے آنکھیں چار کرتے ہوئے ڈرنے لگا۔ لیکن شاید کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ اگلے ہی اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو ایک انتہائی بھاری بھرکم صاحب ہانپتے کانپتے گاڑی میں سوار ہوئے اور مسافروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ان مریل صاحب کے پہلو میں تشریف فرما ہو گئے۔ ان صاحب نے انتہائی حقارت اور غصے سے نووارد کی اس حرکت کو دیکھا اور کچھ دیر تک ماتھے پر تیوری چڑھائے انھیں بڑی سختی سے گھورتے رہے۔ اس کارروائی کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے اپنا شانہ نووارد کے پہلو سے لگا دیا اور پورے جوش اور ولولے کے ساتھ انھیں سیٹ پر سے دھکیلنے کی سعی کا آغاز کر دیا۔ خاصی دیر تک وہ بڑے زور شور سے یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ لیکن وہ بھاری بھرکم صاحب کچھ کھانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انھیں زور آزمائی کا احساس نہیں ہوا۔ بہر حال کچھ مدت تک تو حملہ یکطرفہ تھا اور پھر اچانک ان بھاری بھرکم صاحب کو اپنے ساتھی مسافر کی حرکت کا علم ہو گیا۔ وہ مسکرائے اور ذرا سا پہلو بدل ڈالا۔ لیکن ان کی اس انتہائی بے ضرر حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مریل صاحب سیٹ سے دو گز پرے اچھل کر دوسرے مسافروں پر جا گرے۔ تاہم

انھوں نے ہمت نہ ہاری اور دوبارہ اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ باقی راستہ یہ ڈراما برابر جاری رہا یہ زور لگاتے رہے، وہ مسکراتے اور پہلو بدلتے رہے اور میں جاگتا رہا۔

لیکن فطرتِ انسانی کی بوالعجبیوں کا یہ مطالعہ ہی مجھے ریل کے سفر کی ترغیب نہیں دیتا۔ بلکہ میں تو ان پُر اسرار مناظر میں کھو جانے کے لئے بھی ریل میں سوار ہوتا ہوں جو ریل کی کھڑکی سے باہر حدِ نظر تک پھیلے ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ریل کا سفر بیک وقت مجھے انبوہ اور تنہائی کا احساس دلاتا ہے۔ یعنی جب میں اپنے ساتھی مسافروں کو دیکھتا ہوں جنھیں تقدیر نے زندگی کے مختلف شعبوں سے اٹھا کر چند لحظوں کے لئے ایک جگہ گڈمڈ کر دیا ہے اور جو بھانت بھانت کی بولیوں، انوکھے متضاد خیالات اور بدمزاجی اور مروّت کے مظاہروں سے چمکتی بولتی زندگی کا ایک انتہائی سچّا نمونہ پیش کرتے ہیں تو میں خود بھی اس کلبلاتی ہوئی مخلوق کا ایک جزو بن جاتا ہوں اور اس سنجیدگی سے اپنی آرا کو دلائل سے مضبوط کرتا ہوں گویا فریقِ مخالف کا اقرار ہی میری زندگی کا اہم ترین مشن ہے۔ لیکن پھر جب میں دوسرے ہی لمحے ریل کی کھڑکی سے ایک نظر باہر کی دنیا پر ڈالتا ہوں تو نہ صرف یہ کہ اپنے ساتھی مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز ہو جاتا ہوں بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس طویل و عریض کائنات میں یکہ و تنہا کھڑا ہوں۔ ایسے میں میرے ساتھی مسافروں کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتی تو ہیں لیکن اس طور گویا کسی گہرے کنویں سے آ رہی ہوں اور میری تمام تر توجہ اس ہر آن بدلتے ہوئے منظر پر مرکوز رہتی ہے جو مجھے تیزی سے حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ میں اس منظر کے اجزائے ترکیبی پر غور کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ بظاہر تو محض چند نہروں، کھیتوں اور پہاڑیوں سے اس کی تشکیل ہوئی ہے، لیکن اس کا مجموعی تاثر کس درجہ حسین و دلفریب ہے اور تب ایمرسن کی طرح مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ اس منظر کا ہر جزو کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔ یعنی نہر سرکار کی ہے، کھیت زید کا ہے، مکان بکر کا ہے۔ لیکن یہ منظر ——— سارے کا سارا منظر میرا ہے اور صرف میرا ہے نیلے آسمان پر قرمزی ابر پارے بکھرے ہوئے ہیں اور میرے ساتھ ساتھ دوڑتے جا رہے ہیں۔ حدِ نظر تک کھیتوں اور پہاڑیوں کا دل فریب سلسلہ ہے جو بھنور کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ شام ہونے کو آئی ہے۔ گاڑی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزر رہی ہے۔

گاؤں میں زندگی کی رفتار کس قدر سُست ہے! ایک جوان لڑکی پانی کا گھڑا اٹھائے ہوئے ہولے ہولے رہٹ کی طرف آرہی ہے۔ کوئی گڈریا دھیرے دھیرے اپنے ریوڑ کو لئے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ گاؤں کے تنّور سے گاڑھا گاڑھا سُست رو دھواں اُٹھ رہا ہے اور گاڑی فرّاٹے بھرتی، ہر شے کو پیچھے چھوڑتی، کسی نامعلوم منزل کی جانب اڑی چلی جارہی ہے آپ ہی کہئے کوئی ایسے منظر کو کیسے فراموش کرسکتا ہے! یہ منظر تو دل میں رکھ لینے کے قابل ہے اور میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

لیکن ریل کا سفر محض اڑتے ہوئے مناظر سے حظّ اٹھانے تک ہی محدود نہیں۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو اُن اسٹیشنوں کی زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی ہے جو حرکت اور تموّج کے سمندر میں ننھے خاموش جزیروں کی طرح نظر آتے ہیں اور جن کے کناروں پر ریل گاڑی لحظہ بھر کے لئے رکتی ہے۔ لیکن شاید میں نے ان جزیروں کو خاموش قرار دینے میں غلطی کی ہے۔ کیونکہ اڑتے ہوئے مناظر کی خاموشی کے مقابلے میں یہاں زندگی کی گہما گہمی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ بڑے اسٹیشنوں کی بات نہیں کرتا۔ جہاں ریڑھی والے آپ کی کھڑکی کے عین نیچے آکر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ ہانک لگاتے ہیں۔ تاکہ آپ پر اشیا خریدنے کے لئے نفسیاتی دباؤ ڈال سکیں۔ اور جہاں انجنوں کی ٹنٹنگ، قلیوں کی بھاگ دوڑ اور بدحواس مسافروں کی گھبراہٹ پر آپ کو میدانِ کارزار کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ ان ننھے مُنّے یتیم اسٹیشنوں کی بات کرتا ہوں جہاں اسٹیشن ماسٹر صاحب وردی کے کوٹ کے نیچے لٹھے کی شلوار پہنے ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ لئے، گارڈ کے ڈبّے کی طرف بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اور کانٹے والا بآوازِ بلند انجن ڈرائیور سے چلم کے لئے آگ کا مطالبہ کر رہا ہوتا ہے اور جہاں آپ کو اچانک محسوس ہوتا ہے گویا ایک طویل تنہائی کے بعد آپ نے زندہ و شاداب، تڑپتی اور مسکراتی ہوئی زندگی کا پرتو دیکھا ہے ——— اسٹیشن پر ریل کے ٹھہرنے کا ایک رومانی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رُک جاتی ہے۔ آپ نظریں اُٹھاتے ہیں اور آپ کو پلیٹ فارم کی دوسری طرف محض دو چار ہاتھ کے فاصلے پر کوئی اور مسافر گاڑی کھڑی نظر آتی ہے۔ اب اتفاق دیکھئے کہ

آپ کا ڈبّا جہاں رکتا ہے اس کے عین سامنے کے ڈبّے میں کھڑکی سے لگی کوئی اداس سی حسینہ بیٹھی ہوتی ہے جو آپ کی گاڑی کو رکتے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیتی ہے۔ آپ جلدی سے اٹھتے ہیں۔ بالوں کو سنوارتے ہیں۔ ٹائی کی گرہ درست کرتے ہیں اور جلدی سے واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ آپ کے بیٹھتے ہی انجن کی سیٹی کی تیز آواز آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور محبوبۂ دلنواز کی گاڑی آپ کی تمناؤں اور آشاؤں کو کچلتی، ہولے ہولے پلیٹ فارم پر سے کوچ کر جاتی ہے ——— اب آپ کے سامنے ایک خلا ہے، حسرتوں اور محرومیوں کی خلا جس میں ایک بھدا سا انجن چند مال گاڑیوں کا تعاقب کر رہا ہے۔ آپ اس منظر سے نظریں ہٹا لیتے ہیں۔ لمبا سانس لیتے ہیں اور اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دیتے ہیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ریل کے سفر کے ایسے کئی اور پہلو بھی ہیں، جن کے حق میں بہت کچھ کہا سنا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ریل کا سفر جسمانی آسائش کا موجب بھی ہے، یقین مانئے: ع

"یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی"

تنہائی

انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ——— ہو سکتا ہے کہ بنیادی طور پر کوئی خاص فرق نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزئیات کے معاملے میں ایک کشادہ خلیج کا احساس ہونے لگے۔ پھر یہ بات بھی غیر اغلب نہیں کہ فرق و تفریق کے اس مسئلہ پر ہمیں اور آپ متفق نہ ہوں اور معاملہ مناظرے کا رنگ اختیار کر کے اس قدر طُول کھینچے کہ قابلِ دست اندازیٔ پولیس قرار پائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے ابھی ابھی ایک ایسا نکتہ سُوجھا ہے جس پر ہمیں اور آپ بخوبی متفق ہو سکتے ہیں۔ ویسے خدانخواستہ اگر اتفاق کا مسئلہ امرِ محال نظر آئے تو دوسری صورت تو ہے ہی!

نکتہ یہ ہے کہ انسان کے برعکس حیوان کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ زندگی کے طویل ترین لمحات بغیر کوئی آواز اپنے حلق سے نکالے، بڑے اطمینان سے گزار سکتا ہے ممکن ہے اس مقام پر آپ پطرس کے کتّوں کی مثال دے کر میرے اس نکتے کو اپاہج کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ پطرس کے کتّے بھی کسی خاص تقریب کے موقع پر ہی ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ ورنہ ان کتّوں کا تصوّر کیجئے جو اپنے ہونٹوں پر ابدی چُپ کی مہر لگائے، گلیوں اور بازاروں میں صبح و شام بے مطلب گھومتے ہیں تو شاید آپ کو انسان کے مقابلے

میں حیوان کی کم گوئی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اسی طرح اُونٹ کی مثال لیجئے اور اس کی تسلیم و رضا کا تصوّر کیجئے جب یہ دو ہی لقموں کے بعد بڑے اطمینان سے گھنٹوں بغیر کلام کئے محض رسماً ہونٹ ہلاتا رہتا ہے۔ ممکن ہے یہاں بھی آپ مجھے ٹوکیں اور کہیں کہ انسانوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اُونٹ سے کہیں زیادہ نفاست کے ساتھ اپنے ہونٹ ہلا سکتا ہے۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اس معرکے کے کرداروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اونٹ کے ہونٹ ہلتے تو ہیں لیکن آواز پیدا نہیں ہوتی اور انسانوں کا یہ گروہ ہونٹ کے علاوہ زبان بھی ہلاتا ہے اور بسا اوقات سامعین کو آندھی کے ساتھ ہلکے ہلکے چھینٹوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

——— تو میں عرض کرنے لگا تھا کہ حیوان تو تنہائی کا بڑے سلیقے اور اطمینان سے سامنا کرتا ہے لیکن انسان کو یہ حبسِ دوام کا منظر دکھاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حیوان تنہائی کے ایک عالمِ سکوت آشنا سے خود کو اس طور ہم کنار کر لیتا ہے کہ اس کا اطمینانِ قلب باعثِ رشک ثابت ہوتا ہے۔ لیکن انسان کو اگر تنہائی کے یہ لمحات مل بھی جائیں تو وہ اوّل تو بآوازِ بلند اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ جیسے تنہائی کوئی آسیب ہے جس سے وہ خوف زدہ ہو یا پھر کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے اور مصنّف کی صحبت میں اپنے زخم کا مداوا تلاش کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے سمندِ تخیل کو مہمیز لگا کر تصوّرات کی ایک دُنیا آباد کر لیتا ہے اگر وہ کچھ نہیں کرتا تو تنہائی سے خود کو ہم آہنگ نہیں کرتا اور کائنات کی ابدی چپ میں تحلیل نہیں ہو جاتا۔

لیکن وہ تنہائی سے اس قدر گریزاں کیوں ہے! ——— غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بعض فطری رجحانات کے تحت یہ سوچتا ہے کہ شاید تنہا ہونا بے یار و مددگار ہونے کے مترادف ہے اور اس لئے زندہ رہنے کے لئے تنہائی سے گریز لازمی ہے ۔ نجانے یہ خوف کب تک اس پر مسلّط رہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اسے ایک بار بھی تنہائی سے "ملاقات" کا موقع مل جائے تو پھر وہ کبھی اس سے نالاں یا گریزاں نظر نہیں آئے گا ——— نہ صرف یہ، بلکہ اسے محسوس ہو گا کہ وہ اس ملاقات کے بعد

تازہ دم ہوگیا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا مل گئی ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کو فطری مناظر میں کھو جانے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ یہ کام شعرائے کرام نے مجھ سے کہیں بہتر طریق سے سرانجام دیا ہے۔ دوسرے فطرت کی آغوش میں جو تنہائی حاصل ہوتی ہے، کچھ مخلوط قسم کی تنہائی ہے۔ یعنی اس تنہائی میں انسان اپنے رفقا اور احباب سے تو دور ہٹ جاتا ہے لیکن ان کی جگہ درختوں، پودوں، پھولوں اور ندیوں کو دے دیتا ہے۔ چنانچہ فطرت کی آغوش میں سمٹ آنے پر بھی اُسے وہ "مکمّل تنہائی" حاصل نہیں ہوتی جس کا میں علم بردار ہوں۔ آپ پوچھتے ہیں یہ مکمّل تنہائی کیا ہے؟ ——

پہلے میرا خیال تھا کہ اچھے شعر کی طرح یہ بھی محض اتفاقیہ طور پر ہی وارد ہوتی ہے لیکن ایک بار جب مجھے اس سے "ملاقات" کا شرف حاصل ہوا تو میں نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔ اب میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں آورد کے عناصر نسبتاً زیادہ ہیں اور کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اس کو آواز دے کر بلا سکتا ہے۔ اس کا طریق بھی آسان ہے اور اگر آپ چاہیں تو میرے نقشِ قدم پر چل کر اس سے بخوبی آشنا ہو سکتے ہیں۔ جی نہیں! کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہیں آپ بس اتنا کیجئے کہ آج جب دفتر سے چھٹی ملے اور آپ حسبِ معمول گھر کی تُو تُو مَیں مَیں سے فارغ ہو کر کسی ٹی ہاؤس کی طرف خراماں خراماں آ رہے ہوں تو ٹی ہاؤس کے گدلے اور دھواں دھار "بلیک ہول" میں داخل ہونے کے بجائے چپکے سے دائیں جانب شہر کی کشادہ ترین سڑک کی طرف مڑ جائیے راستے میں بہت سے مناظر دامنِ دل کش ہوں گے اور رنگ و بو کا سیلاب کئی بار آپ کو بہالے جانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن حکما کا قول ہے کہ ایسے موقع پر اگر آپ ایک لمبا سا سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں میں پوری طرح ہوا بھر لیں اور اسے زیادہ سے زیادہ وقت تک خارج نہ ہونے دیں تو آپ کی طبیعت بحال ہو سکتی ہے۔

بہرحال اب کہ آپ شہر کے حسین ترین حصّے میں پہنچ گئے ہیں۔ دائیں جانب مڑ کر سڑک پار کیجئے اور اس خوش نما باغ میں بڑھتے چلے جائیے۔ آپ کی صورت بتا رہی ہے

کہ آپ کو ایک خاموش سے گوشے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ دیکھئے پہاڑی کے دامن میں جھکے ہوئے درختوں کے بالکل نیچے ایک سبز بنچ خالی پڑا ہے۔ وہاں چل کر بیٹھ جائیے۔ یوں نہیں! بنچ پر نیم دراز ہو جائیے اور اپنے جسم کو قطعاً ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ اب اپنے گرد و پیش ایک نظر ڈالئے۔ دیکھئے باغ کا یہ گمنام سا گوشہ کتنا خاموش اور تنہا ہے۔ اتنا خاموش کہ آپ کو فاختہ کی کُو کُو اور بھونرے کی گُن گُن صاف سنائی دے رہی ہے۔ یہی تو فطرت کے گرویدہ شاعروں کا مسکن ہے۔ اسی تنہائی میں ان کی روحوں کے پٹ ہولے سے کھلتے ہیں اور جذبات و احساسات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر چشم زدن میں بہہ نکلتا ہے۔ لیکن آپ شاید محسوس کریں گے کہ یہ تنہائی محض آواز اور ہنگامے کی دنیا سے یک لخت دُور ہٹ آنے کی وجہ سے ہے ورنہ اس تنہائی اور خاموشی کی اپنی آوازیں اور اپنے ہنگامے بھی ہیں ——— مگر آپ تو شاید "مکمل تنہائی" کی تلاش میں تھے؟ اچھا! تو اپنا سر بنچ کی پشت سے لگا دیجئے اور آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیجئے۔ آنکھیں بند کرتے ہی آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ اپنے گرد و پیش کی اس روشن دنیا سے جس میں حرکت، رنگ اور تغیّر کی فراوانی ہے۔ ایک لخت کٹ کر ایک تاریک سے مسکن میں سمٹ آئے ہیں۔ اور تنہائی کا ایک بہت بڑا عنصر لپک کر آپ کی دنیا پر مسلّط ہو گیا ہے۔ اب زندگی کی حرکت اور گریز پائی، اس کی رنگا رنگی اور تنوّع، آپ کی نظروں سے اوجھل ہے اور اس کی جگہ اندھیرے کی یک رنگی نے لے لی ہے۔ "مکمل تنہائی" کی طرح آپ کا یہ پہلا قدم ہے ——— اب اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیجئے۔ اس طور کہ آنکھیں بند کرنے پر بھی جو آوازیں آپ کی تنہائی میں مخل ہو رہی تھیں، یک لخت منہ بسورے رخصت ہو جائیں۔ دیکھئے اب تنہائی کسی شرمیلی دلھن کی طرح ایک قدم اور آپ کی طرف بڑھ آئی ہے۔ آپ کے اور زندگی کی ہاؤ ہو اور شوریدہ سری کے درمیان جو چند دھاگے بندھے تھے، ان میں سے ایک اور مضبوط دھاگا ٹوٹ گیا ہے۔ مگر ابھی آپ اپنے خیالات اور تصورات کی انجمن آرائی سے شاید محفوظ نہیں۔ اچھا تو اب اپنے ذہن کی سلیٹ کو اسفنج کے ٹکڑے سے صاف کیجئے اور سپید کاغذ کی طرح

بے خیال ہو جائیے۔ دیکھئے "مکمل تنہائی" کی یہ پاکیزہ ترین صورت ہے۔ ایک ایسی تنہائی جس میں آپ کے دیکھنے سُننے اور سوچنے کی تمام صلاحیتیں مہر بہ لب ہیں۔ مگر خدا کرے اس وقت کوئی مچھر شیوۂ مردانگی کے فرسودہ تصوّر کو تج کر، بڑی خاموشی سے بڑھے اور آپ کے پاؤں کو مشقِ ناز کے لئے منتخب کر لے تاکہ آپ کو محسوس ہو کہ ابھی آپ اور آپ کی کائنات کے درمیان "لمس" کا رشتہ باقی ہے۔ لیکن خدارا اس رشتے کو ضرور برقرار رکھئے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی یہ "مکمل تنہائی" ابدی صورت اختیار کر لے اور مجھے مفت میں پشیمان ہونا پڑے۔

دُھند

ہر صبح جب میری آنکھ کُھلتی ہے تو میں تڑپ کر بستر میں سے نکل آتا ہوں اور ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا ہوا ڈائننگ روم کی کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ میری اس عجیب سی اضطراری حرکت سے گھر کے بیشتر افراد نالاں ہیں۔ خاص طور پر میری بیوی تو اسے سخت ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ البتہ میرے بھائی کے خیال میں میری یہ اضطراری حرکت کوئی مشکوک یا قابلِ نفرت عمل نہیں اور نہ یہ کسی ذہنی بیماری ہی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کی دانست میں میرے اس عمل کے پسِ پشت صرف یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں گھر کے افراد نے میرے بیدار ہونے سے پہلے پہلے ناشتہ کی میز تو صاف نہیں کر دی ——— دراصل ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں۔ میری اس اضطراری حرکت کی وجہ محض یہ ہے کہ میں اس سنہری منظر کو دیکھنے کا متمنّی ہوتا ہوں جب ابھرتے ہوئے سُورج کی شعاعیں سامنے کے پہاڑ پر چیڑ کے گھنے جنگل میں آگ لگا دیتی ہیں۔ اور سارا ماحول ایک دلنواز رخشندگی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ درختوں پر جھکے ہوئے قرمزی رنگ کے ابر پارے جگمگا اٹھتے ہیں اور پہاڑ کی کمر سے لپٹی ہوئی پیچدار سڑک سونے کے تار کی طرح چمکنے لگتی ہے۔

اس منظر کی حیات اتنی مختصر ہوتی ہے کہ اگر چند لمحوں کی بھی دیر ہو جائے تو پھر مجھے دوسرے روز تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں بیدار ہوتے ہی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف لپکتا ہوں۔ اس سے میری بیوی کو خواہ نخواہ میرے ذہنی توازن پر شک گزرنے لگتا ہے اور میرے بھائی کو اپنے ناشتے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

لیکن آج صبح جب میں حسبِ معمول تڑپ کر بستر میں سے نکلا اور بیوی کے تفکر اور بھائی کے زہر خند کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی میں آن کھڑا ہوا تو صبح کا مانوس منظر مجھے دکھائی نہیں دیا۔ یہ نہیں کہ میں دیر سے بیدار ہوا تھا اور سورج اپنے مخصوص زاویے سے بلند ہو چکا تھا بلکہ عجیب بات یہ تھی کہ پہاڑ، چیڑ کے جنگل، سونے کے تار کی طرح چمکتی ہوئی سڑک اور قرمزی رنگ کے ابر پارے ——— ان میں سے کوئی شے بھی موجود نہیں تھی۔ ان کی جگہ چاروں طرف ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جس میں میرا مکان ایک بے پتوار کشتی کی طرح بہتا چلا جا رہا تھا ——— گویا طوفانِ نوحؑ نے ایک بار پھر زمین کو نگل لیا تھا اور میں کسی نہ کسی طرح نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

لیکن جب میں نے زور زور سے آنکھیں ملیں اور پلکیں جھپکا جھپکا کر ماحول پر نگاہ دوڑائی تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جسے میں سمندر سمجھ رہا تھا وہ تو محض برسات کی پہلی دھند تھی ——— دھند جس نے گلیم ڈال کر ہر شے کو غائب کر دیا تھا۔

اور پھر کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا لڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوا اور سفید دھند کا مرغولہ میرے جسم کو چھوتا ہوا اور میری نس نس میں ایک عجیب سے خوش گوار لمس کا تاثر چھوڑتا ہوا میرے قریب سے نکل گیا۔ ہوا کے اس آوارہ جھونکے سے دھند کچھ لطیف ہو گئی اور اس کی دودھیا سکرین پر دیو قامت درختوں کے سائے ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ننھی ننھی پہاڑی پگڈنڈیاں بھی نظر آنے لگیں۔ جن پر اکا دکا پہاڑی کسان پانی کا کنستر اٹھائے ایک ٹوٹی ہوئی پتنگ کی طرح سنبھلتا لڑکھڑاتا دکھائی دے جاتا۔ پھر اچانک دھند کے اس پردے میں ایک بڑا سا شگاف نمودار ہوا اور درختوں سے ڈھکا ہوا سامنے کا پہاڑ ایک الف لیلوی قلعے کی طرح نمودار ہو گیا۔ اس قلعے پر

ایک بڑا سا محل تھا۔ جس کی چھت پر کوئی پری اپنے پروں کو سمیٹے اور افق پر نظریں گاڑے بیحس و حرکت کھڑی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ میں اس پری کا چہرہ دیکھ سکتا، دُھند کے ایک آوارہ آنچل نے سارے کے سارے پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور چاروں طرف دھند کے مرغولے ننھے ننھے بھوتوں کی طرح ناچنے لگے۔

لیکن یہ سارا قصہ صبح کا ہے ـــــ صبح جو اب میرے ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اس وقت جب کہ چاروں طرف شام کی آمد آمد ہے، میرے اور اس پُراسرار صبح کے درمیان سینکڑوں دھندلے لمحات حائل ہو چکے ہیں۔ تاہم دھند جیسے تب مسلط تھی، ویسے ہی اب بھی چھائی ہوئی ہے۔ البتہ ماحول میں فرق ضرور ہے اور دُھند کے تیور بھی کچھ بدل گئے ہیں۔ صبح میں نے ڈائننگ روم کی کھڑکی سے پہلی بار دھند کا نظارہ کیا تھا اور کیف و وارفتگی کے سیلِ رواں میں ڈوب ڈوب گیا تھا۔ اور اب میں گزرگاہ کے کنارے ایک اکیلی چیڑ کے نیچے بیٹھا دھند سے ہم کنار ہو رہا ہوں۔ گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ لیکن ہر قمقمے کے گرد دھند نے ایک طلسماتی کیفیت قائم کر رکھی ہے۔ قمقمہ دھند کے سحر سے پار دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن دُھند مسکرا کر اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ اور اس کی یہ مسکراہٹ ابدی طور پر قمقمے کے گرداگرد ایک ہالہ سا بن کر رہ گئی ہے۔ دھند اور نور کی اس آویزش سے بے نیاز کچھ سائے گزرگاہ کو اپنے قدموں سے روندتے رہے ہیں۔ جب وہ قمقمے کے نیچے سے گزرنے لگتے ہیں تو نورانی دھند ان کے چہروں پر ملکوتی حسن بکھیر دیتی ہے۔ لیکن جب وہ ذرا آگے بڑھتے ہیں تو دھندلے ہوتے ہوتے غائب ہو جاتے ہیں۔ تا آنکہ دوسرے قمقمے کے قریب انھیں پھر ایک حیاتِ تازہ حاصل ہو جاتی ہے۔

میرے چاروں طرف خاموشی کی بادشاہت قائم ہے۔ البتہ جب دھند کا کوئی سفید آنچل چیڑ کی شاخوں میں اٹک جاتا ہے تو چیڑ کی ٹہنیوں سے موتیوں جیسے قطرے ایک ہلکی سی جھنکار کے ساتھ میرے شانوں پر آ گرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی چھا جاتی ہے۔ ـــــ ازلی و ابدی لامتناہی خموشی۔ دھند کا ایک اور آنچل بڑھتا ہے۔ پھر ایک جھنکار سنائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ جیسے دُھند کے

لمس پر چیڑ کے آنسو چھلکتے ہی رہیں گے ـــــ مجھے دھند کا یہ انداز اچھا لگتا ہے۔ اس نے مجھے انبوہ میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کا ایک شیریں احساس بخشا ہے۔ میرے چاروں طرف تڑپتی اور گنگناتی ہوئی زندگی اسی طرح قائم ہے۔ لیکن اس دھند کے طفیل میں اور میری طرح ہر ذی روح ایک جزیرے کی طرح زندگی کے برِ اعظم سے کٹ گیا ہے۔ دھند نے ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔ ہماری شخصیتوں کی حدود متعین کی ہیں۔ ہمیں انبوہ میں کھو جانے سے باز رکھا ہے۔

چیڑ کے نیچے سبزۂ نورستہ پر نیم دراز، میں ایک عجیب سی دنیا میں جا پہنچا ہوں۔ ـــــ ایک ایسی دنیا جو حقیقت کی کرخت اور ٹھوس دنیا سے کسی قدر مختلف ہے۔ لیکن شاید دنیا تو وہی ہے۔ صرف میرے محسوسات تبدیل ہو گئے ہیں۔ دھند نے، دھند کی عجیب سی غیر مانوس خوشبو نے، دھند کے لطیف اور بھاریں آنچل نے نہ صرف ہر شے کی کرختگی کو ڈھانپ لیا ہے، بلکہ احساسات و جذبات میں بھی ایک ملائمت پیدا کر دی ہے دھند کا یہ عمل کس قدر قیمتی ہے کہ چند لمحوں کے لیے سہی، اس کرخت اور ٹھوس دنیا کے نشیب و فراز تو برابر ہو گئے ہیں۔ دھند کسی ایک کی رعایت نہیں کرتی۔ محل، جھونپڑی، پہاڑ، ندی، امیر، غریب ہر کسی کو دھند کی دیوی اپنی گود میں لے کر سلا دیتی ہے ـــــ مادی دنیا کے نشیب و فراز، اذہان کی خلیج، روحوں کا ازلی اور ابدی فرق ـــــ کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا ہاں اگر کچھ باقی رہتا ہے تو وہ دھند کا سیلِ رواں ہے جو نہ جانے کس روزنِ کوہ سے نکلا ہے اور نہ جانے کس دامانِ کوہ کی طرف رواں دواں ہے۔

دھند کی ایک موج پھر میرے قریب سے نکل گئی ہے۔ میں سوچنے لگا ہوں دھند اور بادل میں بہ ظاہر کوئی فرق نہیں۔ دونوں پانی کے بخارات ہی تو ہیں۔ لیکن یہی بخارات بلندی پر پہنچ جائیں تو بادل کہلاتے ہیں اور زمین پر اتر آئیں تو دھند بن جاتے ہیں۔ جب تک یہ بلندیوں پر رہتے ہیں۔ ان کے طریقِ کار میں سنگ دلی، شقاوت، بے نیازی اور غرور سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ چمکتے ہیں، گرجتے ہیں اور دہشت کے فرشتے بن کر زمین کے باسیوں کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ عرش سے اتر کر فرش پر آتے ہیں تو نہ ان میں گرج باقی رہتی ہے نہ چمک

——— یہ دُھند کی دیوی کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ دیوی جس کے ریشمی آنچل زمین کے تمام باسیوں کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ پیار سے ہم کنار کر لیتے ہیں۔ سوچتا ہوں اِن پانی کے بخارات کا کوئی قصور نہیں۔ بلندی شاید ہر شے کی فطرت کو بدل دیتی ہے۔

دُھند کچھ اور گہری ہو رہی ہے۔ شاید شام کے کارواں نے اپنی منزل کو پا لیا ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ہولے ہولے چلتا گزرگاہ کے سایوں میں تحلیل ہو جاتا ہوں۔

وہ

بظاہر "وہ" ایک سادہ بے ضرر سا لفظ ہے۔ لیکن اس کے بطن میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ عام زندگی تُو اور مَیں، طول اور عرض پر مشتمل ہے۔ لیکن "وہ" سے زندگی میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ زندگی کی سادہ اور یک سطحی فلم میں جب "وہ" کا عنصر شامل ہوتا ہے تو یہ فلم ۳۔ ڈی فلم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی "وہ" کی خصوصیت ہے اور آئین سٹائن کے نظریہ اضافت کے بعد غالباً یہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی "دریافت" ہے۔ جس پر یہ ناچیز جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

لیکن آپ شاید یہ جاننا پسند کریں گے کہ اتنی بڑی "دریافت" کس لمحۂ خود فراموشی کی پیداوار ہے ——— میں ایک منٹ ضائع کئے بغیر یہ عرض کروں گا کہ اس ناچیز کو پچھلے موسم سرما میں یہ سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اس روز آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور شمال سے آتی ہوئی سرد ہوا انسانی جسم کا ایکس رے لینے پر بضد دکھائی دیتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے مکان اور لباس کے حصار کوئی رکاوٹ پیش نہیں کر سکیں گے ہم چند دوستوں نے ایک پہاڑی مکان میں پناہ لے لی تھی۔ اور آگ جلانے کا مقدس فرض مجھے

سونپ دیا گیا تھا۔ میں نے بھی ایک مردِ مجاہد کی طرح یہ چیلنج قبول کر لیا تھا اور دو لکڑیوں کے سروں کو جوڑ کر ان پر ایک پجاری کی طرح جھک گیا تھا۔ ماچس کی تیلیاں بڑی پھرتی سے جل رہی تھیں۔ دھواں بھی اٹھنے لگا تھا۔ پھونکوں سے راکھ اور کوئلے بھی رقص میں آ گئے تھے۔ اور ساری کائنات میں ایک زلزلہ بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن آگ تھی کہ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ میرے ساتھی نجانے کس مٹی کے بنے تھے کہ ایک طنزیہ تبسم سے میری شکستوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ لیکن عملی امداد کے قائل نظر نہیں آتے تھے ——— اور تب ان میں سے ایک بزرگ کے دل میں نجانے کہاں سے رحم کی ایک چنگاری سلگ اٹھی اور انھوں نے انسانی اخوّت کے دباؤ سے مجبور ہو کر کہہ دیا ——— "تیسری لکڑی لگاؤ تو آگ جلے"۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح یہ بزرگ بھی آگ جلانے کی تمام روایات سے نابلد محض ہیں۔ چنانچہ محض ان کے نظریئے کی شکست سے محظوظ ہونے کے لئے میں نے دو لکڑیوں میں تیسری لکڑی کو شامل کیا اور ایک طنزیہ پھونک سے راکھ کو اڑانے کی کوشش کی ——— یکایک ایک شعلہ بلند ہوا اور تینوں لکڑیاں جلنے لگیں۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر ان صاحب کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ میری شکست و فتح سے بے نیاز اونگھتے اونگھتے سجدے میں گر چکے تھے۔ اور تب ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیدا ہوا۔ اور میں ارشمیدس کی تقلید میں "یوریکا! یوریکا!" کا نعرہ بلند کرتا ہوا باہر کو لپکا۔ لیکن دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ باہر شدید سردی تھی اور کمرہ گرم ہو رہا تھا اور ارشمیدس کو مرے صدیاں گزر چکی تھیں۔ چنانچہ میں ہولے ہولے چلتا واپس آ گیا۔

میرے لئے یہ واقعہ بے حد اہم ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں اب آگ جلانے (یا ممکن ہے آپ کہیں کہ آگ لگانے) کا ماہر ہو گیا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ مجھے پہلی بار تیسری لکڑی کی اہمیت کا ایک شدید احساس ہوا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تیسری لکڑی وہی "وہ" ہے جس کے بغیر نہ تو زندگی میں شعلہ بھڑکتا ہے اور نہ کوئی حرارت ہی پھیلتی ہے۔ غور کیجئے کیا زندگی کا ہر ڈراما اسی "وہ" کا رہینِ منّت نہیں ہے؟ کیونکہ جب تک "میں" اور "تو" کی کہانی میں "وہ" کا عنصر داخل نہ ہو۔ کہانی سپاٹ اور چٹیل رہے گی۔ اور

اس میں ڈراما کا عنصر پیدا ہی نہیں ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں دھواں تو اٹھے گا۔ لیکن شعلہ نہیں بھڑکے گا۔ شاید اسی لئے ہر ڈراما بلکہ ہر کہانی میں ولین VILLAIN کا وجود بے حد ضروری ہے ——— چاہے یہ ولین ایک گوشت پوست کے انسان کی صورت میں ظاہر ہو۔ سوسائٹی یا سماج کے لباس میں نمودار ہو یا محض انسانی ضمیر کی شکل اختیار کر لے۔ مختصراً زندگی کی ساری رعنائی اور حسن ایک کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتا ہے اور زندگی کی کشمکش اس "وہ" کے بغیر معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتی جو ڈرامے میں ولین لیکن چولے تک پہنچتے پہنچتے تیسری لکڑی بن جاتا ہے۔

"وہ" کو اس کے فنی مدارج پر دیکھنا ہو تو اردو کے ان شعرائے کرام کی طرف توجہ کیجئے جنھیں فطرت نے نام کے علاوہ تخلص بھی عطا کیا ہے۔ عام زندگی میں ایک اوسط درجے کے اردو شاعر کا نام اگر مسکین علی ہے اور وہ صابن کے کارخانے میں کام کرتا ہے تو شاعری کی دنیا میں لوگ اسے دہشت افغانی کے نام سے پکاریں گے اور یہ تخلص اس کی شخصیت کے تیسرے پہلو کو ابھارنے میں مدد دے گا۔ یہ شخص جب تک محض مسکین علی ہے اور صابن کے کارخانے میں کام کرتا ہے تو زندگی میں نہ کوئی ہنگامہ پیدا ہوتا ہے اور نہ رنگینی ہی آتی ہے۔ لیکن جونہی مسکین علی اور صابن کے کارخانے کی دنیا میں دہشت افغانی وارد ہوتے ہیں تو ایک شعلہ سا بلند ہوتا ہے اور جذبات و احساسات کا ایک سمندر موجزن ہونے لگتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے مشاعرے کی فضا ہنگامہ خیز ہو جاتی ہے اور واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے عقب میں بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! کے دلکش آوازے سنائی دینے لگتے ہیں۔ اس سے سپاٹ اور بے رنگ فضا میں زندگی کی لہر سی دوڑنے لگتی ہے اور یار لوگوں کی تفریح طبع کے لئے وافر سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بھلا "وہ" کے بغیر کبھی زندگی میں ایسا لطف پیدا ہوا ہے؟

"وہ" کو زمینی ہی نہیں بلکہ کائناتی مسائل میں بھی اہمیت حاصل ہے۔ غور فرمائیے کہ آغازِ کار میں ساری کائنات صرف دو حقیقتوں پر مشتمل تھی۔ ایک حقیقت اس خدا کے لایزال کی تھی جس نے ہر شے کو تخلیق کیا تھا۔ دوسری حقیقت ان مظاہر کی تھی جو خالق کے

ایک ادنیٰ اشارے پر عالمِ وجود میں آ گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ایک طرف خدا تھا۔ دوسری طرف فرشتے تھے۔ یہ حقیقتیں خیر کی علم بردار تھیں۔ زندگی میں کوئی ہنگامہ، کوئی کشمکش، کوئی تگ و دو نہ تھی ——— ہر شے پر موت کا سا منجمد سکوت طاری تھا۔ آدم ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ بھی جنّت کی خاموش اور پُر سکون فضا میں ایک درویش کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی بحیثیت مجموعی بے حد سادہ، مفلس اور سپاٹ تھی ——— اور پھر یکایک وہ تیسری حقیقت عالمِ وجود میں آئی جسے آپ شاید "ابلیس" کا نام دیں۔ لیکن جسے میں "وہ" کے لقب سے پکاروں گا۔ ابلیس نے آتے ہی بجھتی ہوئی چنگاری کو ہوا دی، ایک شعلۂ جوّالا بلند ہوا اور کائناتِ خیر میں ایک ایسا ہنگامۂ شر برپا ہوا جو آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں، رنگینیوں اور بوالعجبیوں کے ساتھ جاری ہے۔ بلکہ روز بروز خوب تر اور شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ اگر کائنات میں "وہ" پیدا نہ ہوتا تو انسان جنت کی چار دیواری میں ہی زندگی کی بے رنگ گھڑیاں گزار رہا ہوتا اور پھر یہ بھی سوچئے کہ ایسی صورت میں آج اس کا آرٹ، لٹریچر، فلسفہ، سائنس، زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ صلح و جنگ کی دلچسپیاں، نئے نئے نظریے بھانت بھانت کی بولیاں ——— یہ سب کچھ کہاں ہوتا؟ اور اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو زندگی کیسی سپاٹ، سادہ اور مفلس ہوتی! مرزا غالب بھی تو کہہ گئے ہیں۔ ع:

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق"۔

دوسرا مصرعہ چونکہ زیادہ کارآمد نہیں۔ اس لئے حذف کرتا ہوں اور اس جسارت کے لئے غالب کی روح سے معذرت خواہ ہوں۔

آسیب

اب کی بار مری کا موسم تو حسبِ معمول خوش گوار تھا۔ اور مری کی شام میں شامِ اودھ کے تیور بھی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ مسرّت اور طمانیت کی یہ ساری نمائش مصنوعی ہے۔ اور غازے سے اٹے ہوئے چہروں اور تبسم میں رنگے ہوئے ہونٹوں کے پسِ پشت، مردہ دلی کا آسیب دانت نکالے کھڑا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو اور حقیقت صرف اس قدر ہو کہ میں خود اداسی اور مردہ دلی کا شکار تھا۔ اور میں نے ایک خاص "موڈ" کے آئینے میں سے ماحول کا نظارہ کیا تھا۔ چنانچہ مجھے سارے کا سارا ماحول ہی بجھا بجھا اور بے کیف سا نظر آ رہا تھا۔ ن ـــــ سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے (غالباً میرا دل رکھنے کے لئے) میرے تاثر کو درست قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی کچھ ادبی مجالس کا اہتمام بھی کر دیا تاکہ علم و ادب کی شمعیں اس تاریکی کو دور کر سکیں جو میرے قلب و نظر پر مسلط تھی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور میری اداسی اور مردہ دلی نے بڑی آسانی سے ان مجالس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زندگی کے اس نازک موڑ پر حضرت ـــــ ج نے میری "مشکل کشائی" کی اور ایک شام بڑے رازدارانہ انداز میں مجھے اپنی دکان کے سب سے پراسرار کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ کوئی ایک گز چوڑا اور سولہ گز لمبا

ہے۔ تاریکی کو دور کرنے کے لئے دیوار میں ایک چھوٹا سا روزن ہے۔ دم گھنٹے کی صورت میں اس روزن سے منہ لگا کر ہوا کو اندر کھینچا جا سکتا ہے۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا میز ہے جس پر عجیب و غریب اوزار، ہڈیوں کے چارٹ اور ایک ناکارہ کھوپڑی پڑی ہے۔ (کارآمد کھوپڑی ان کی اپنی تحویل میں ہے) دیوار کے ساتھ ایک شلف ہے جس پر کرم خوردہ کتابوں کا ایک انبار سا بڑا ہے۔ حضرت ——— ج نے کمرے کی نیم تاریک فضا میں اس شلف کی طرف اشارہ کیا اور پھر انبار میں سے ایک نہایت فرسودہ کتاب اٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ اور اپنے مخصوص انداز سے میری کلائی اپنے آہنی پنجے میں پکڑے دکان سے باہر آ گئے۔ روشنی میں آ کر میں نے کتاب کی جلد پر ایک نظر ڈالی تو جلی حروف میں لکھا تھا۔ GHOST STORIES میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو کہنے لگے ——— "آپ اداسی کی بات کرتے تھے نا! تیر بہدف نسخہ ہے۔ آزما کر دیکھ لیں!"

میرے جی میں آئی کہ کتاب کو پورے زور سے ان کی ابھری ہوئی ناک پر دے ماروں اور کہوں کہ میں ایسی لچر کتابیں نہیں پڑھا کرتا۔ لیکن پھر میں نے ان کے چوڑے سینے، ابھرے ہوئے پٹھوں اور آہنی پنجوں کی طرف دیکھا تو ایک خوشگوار سا تبسم از خود میرے ہونٹوں پر نمودار ہو گیا اور میں نے صمیمِ قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کتاب قبول کر لی۔

کتاب کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں اس کا مطالعہ بھی ضرور کرتا لیکن اسی رات جب میں بستر میں لیٹا سونے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو معاً مجھے خیال آیا کہ اگلی صبح اگر حضرت ——— ج نے کتاب کے بعض شہرہ آفاق جنوں یا بھوتوں کے کارہائے نمایاں کے بارے میں پوچھ لیا تو میں انہیں جواب نہ دے سکوں گا۔ اور جواب نہ دے سکنے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں نے ان کی عنایت کردہ کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ یکایک میری چشمِ تصور کے سامنے آہنی پنجے اور ابھرے ہوئے پٹھے ناچنے لگے۔ چنانچہ میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ ان کی کتاب اٹھائی اور دیوار کے ساتھ تکیہ لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ پھر میں نے یونہی کتاب کی ورق گردانی شروع کی۔ اور

کہیں کہیں سے ایک آدھ سطر پڑھنے لگا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ میں کچھ وثوق سے عرض نہیں کر سکوں گا۔ البتہ جب میں نے گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ساری کتاب ختم ہو چکی تھی۔ اور میں ایک طلسمی پُراسرار فضا میں ایک تنکے کی طرح سرگرداں تھا۔ زندگی کے آغاز و انجام ناپید تھے۔ اور حقیقت کی ٹھوس دنیا کی بجائے غیر ارضی مخلوق کی پرچھائیاں ہر طرف ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ بجلی بند کرنے کے لئے مجھے بستر سے باہر نکلنا تھا۔ لیکن ہمت جواب دے چکی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں زمین پر پاؤں رکھوں اور چارپائی کے نیچے سے ننگی ہڈیوں کا کوئی پنجہ نکل کر اسے اپنی گرفت میں لے لے۔ چنانچہ میں نے بستر پر کھڑے ہو کر اور وہیں سے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبایا اور تاریکی کے محیط ہونے سے قبل ہی لپک کر لحاف میں گھس گیا۔ عین اس وقت بجلی چمکی اور بادل زور سے کڑکا اور ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک پاگل جھونکا کمرے میں بیباکانہ گھس آیا ——— پھر نہ جانے کیسے غسل خانے کا دروازہ ایک دھماکہ کے ساتھ کھلا اور میز پر رکھا ہوا گلدان فرش پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ میں نے لحاف اپنے گرد اور بھی اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ اور تمام خوف ناک تصورات کو ذہن سے خارج کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کہاں؟ ——— یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ پھر جیسے کوئی میری پائنتی آ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر پیٹ کے ساتھ لگا لیں اور سانس روک لیا۔ عین اس وقت کسی کے آہِ سرد بھرنے کی آواز آئی۔ اور غسل خانے کا دروازہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا ——— لیکن اس وقت تک میرے اعصاب قطعاً مفلوج ہو چکے تھے اور میں حقیقت کی دنیا سے ——— خواب کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ مگر خواب کی دنیا تو حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ سب سے پہلے تو میں نے ایک دیوہیکل دیو دیکھا جو پہاڑ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اور مجھے دیکھ دیکھ کر بے ہنگم قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے ہر قہقہے پر پہاڑ کی چوٹی سے بڑے بڑے پتھروں کے لڑھکنے کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن

میرا خیال ہے کہ اس دیو کی شکل حضرت ـــــ جؔ سے ملتی جلتی تھی۔ یہ بات میرے خوف میں مزید اضافے کا موجب تھی۔ پھر میں نے ایک غار میں چند نہایت بدصورت جنّوں کو غیر ارضی سُروں میں اور غیر انسانی چیخوں کے ساتھ کچھ گاتے ہوئے سنا۔ یہ آوازیں اس قدر بھیانک تھیں اور ان کو نکالتے وقت جنّوں کے چہرے اتنے ڈراؤنے دکھائی دے رہے تھے کہ معاً مجھے وہ چھوٹی سی محفلِ موسیقی یاد آ گئی جو چند روز پیشتر منعقد ہوئی تھی ـــــ یہ بات مجھے حواس باختہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔ چنانچہ میں نے حسبِ قاعدہ ایک چیخ ماری اور بیدار ہو گیا۔ اس وقت تک سُورج سوا نیزے کے قریب بلند ہو چکا تھا۔

اب مری کے شب و روز ہی بدل گئے۔ وہ اگلی سی بے کیفی اور اداسی نام کو باقی نہ رہی۔ اس کی جگہ ایک عجیب سی اضطراری کیفیت نے لے لی۔ مجھے ہر تنومند آدمی پر دیو کا گمان ہوتا۔ ہر کالے نقاب کے پیچھے چمکتے ہوئے لانبے لانبے دانت نظر آتے اور بچوں کے گروہ بھوتوں کی فوج کی طرح دکھائی دیتے۔ پھر شام کے دھندلکے چھا جاتے اور سونے کا وقت قریب آ جاتا۔ ادھر بجلی بجھتی اور اُدھر کمرے میں سائے سے ناچنے لگتے۔ غسل خانے کا دروازہ کراہنے لگتا ـــــ اور ٹھنڈی ہوا کی آہیں کمرے میں آزادانہ گھومنے پھرنے لگتیں۔ پھر میں سو جاتا۔ بڑے ڈراؤنے خواب آتے حتّٰی کہ کسی محفلِ موسیقی یا محفلِ مشاعرہ کی یاد آتے ہی ایک شکستہ چیخ میرے ہونٹوں سے نکل جاتی اور میں بیدار ہو جاتا۔

پہلے وقت کی رفتار تھمی ہوئی تھی۔ اب وہ صبا رفتار گھوڑے پر سوار اڑتا ہوا دکھائی دیا اور دیکھتے دیکھتے مہینے کے تیس دن گزر گئے جو میں نے مری کے لئے وقف کر رکھے تھے۔

اور اب میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اگرچہ مری کے اس قیام کے دوران میں ایک غیر ارضی مخلوق نے مجھے مسلسل پریشان کیا اور ایک مستقل خوف نے میرے رگ و پے پر اپنا تسلط قائم رکھا تاہم یہ تجربہ کس قدر دل کش اور یہ خوف کس درجہ لذّت بخش تھا ـــــ بے شک موجودہ دور انکشاف و عرفان کا دور ہے جو تاریکی کو باطل کر کے روشنی پھیلاتا اور

زندگی کی کہنگی کو عریان کرتا ہے۔ لیکن کیا یہ آپ کو ایسی پُر اسرار لذّت بھی عطا کر سکتا ہے؟ روشنی کے کوندے اور عرفان کے ایک لمحے کے گذرتے ہی آپ پہلے سے بھی زیادہ اداس اور شکستہ دل نظر آتے ہیں۔ اور آپ کا ماحول کچھ اور بھی بے کیف اور بیجا بیجا دکھائی دینے لگتا ہے ——— اس لئے کہ انکشاف و عرفان سے زندگی کا گھر در اپن عریاں ہوتا ہے۔ اور حیرت و استعجاب کا عنصر فنا ہو جاتا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد اس صورتِ حال سے کس قدر محفوظ تھے! ان کی دنیا محض ٹھوس مادے کی سنگلاخ دنیا نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق غیر ارضی مخلوق کے ساتھ بھی قائم تھا۔ وہ تاریکی کو دور کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے وجود سے مسرت اور اطمینان کا خزانہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی دنیا میں درخت پہاڑ اور پرندے ہی نہیں بلکہ جن، بھوت، پریاں اور دیو بھی سرگرم عمل تھے اور ان کے معاملات میں برابر کے شریک تھے۔ مگر اب تو تہذیب، سائنس اور فلسفے نے اس تاریک، پُر اسرار پرچھائیوں سے اٹی ہوئی دنیا کا خاتمہ ہی کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ ریاضیاتی طور پر پیمائش کی ہوئی دنیا اور ماپ تول کر تشکیل دیتے ہوئے نظریات عنایت کر دیئے ہیں۔ ایسی دنیا میں وقت کاٹنا کس قدر مشکل ہے! ——— چنانچہ اب کی بار مری میں جب مجھے اپنے آباؤ اجداد کی وہ پُر اسرار تاریک اور غیر مادی دنیا عطا ہوئی اور میں دھڑکتے ہوئے دل اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس کی پہنائیوں میں کود گیا تو مجھے وہ لذّت حاصل ہوئی جو محض روشنی میں پھرتے ہوئے انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس تجربے نے میرے ذوقِ تجسس کو جلا دی اور مجھے ایک ایسی دنیا کی سیر کرائی جس کے اصول ہی مختلف اور نرالے تھے۔ میں نے اس تاریک اور پر اسرار طلسم کو منطق اور انکشاف سے باطل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں اسے بعینہٖ تسلیم کر لیا ——— یکایک مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ کسی شے کا پرکشش ہونا تو محض اس بات کے تابع ہے کہ وہ کہاں تک پُر اسرار، خواب آگیں اور طلسمی کیفیات میں لپٹی ہوئی ہے۔ دوسری طرف روشنی کا کام اس کی کھردری سطح کی نمایش کر کے، اس کی کشش کو فنا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں! نہ جانے کیسے یہ نکتہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا ——— حضرت ——— ج کا ممنون ہوں کہ ان کی عطا کردہ کتاب نے مجھے دوبارہ اس سے آشنا کیا۔

لحاف

اہلِ وطن کا ایک بہت بڑا طبقہ اس حسین سے فریب میں مبتلا ہے کہ لحاف کے بغیر انسانی جسم منجمد کر دینے والی سردی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ میرے نزدیک یہ محض ایک خوش فہمی ہے جو شدت اختیار کر کے غلط فہمی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اوّل تو یہی دیکھئے کہ جو لوگ لحاف استعمال نہیں کرتے کیا وہ سردی کے ہاتھوں اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں؟ ـــــ قطب شمالی میں رینڈیر کی کھال اور دوسرے ممالک میں اون کے کمبل اور بجلی کے ہیٹر وہی کام دیتے ہیں جو ہمارے ملک میں لحاف سرانجام دیتا ہے۔ پھر لحاف نفاست اور لطافت سے ناآشنا بھی تو ہے! رینڈیر کی کھال کو لیجئے۔ کیسی نرم اور خوبصورت ہے۔ (کم سے کم کتابوں میں اسی طرح لکھا ہے) یا اونی کمبل کا تصوّر کیجئے جس کا حسن نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے لیکن لحاف کو دیکھئے کہ یہ کس قدر موٹی، بھدّی اور بدنما شے ہے جسے نفاست، فن اور حسن نے چھوا تک نہیں! ممکن ہے اس مقام پر آپ قومی توہین کو برداشت نہ کرتے ہوئے لحاف کے بعض خوبصورت نمونوں کا ذکر چھیڑیں اور "سب سے اچھی میری بنڈی، ان کوٹوں کو کالی جھنڈی" کا ورد کرتے ہوئے لحاف کو کمبل اور رینڈیر دونوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن چونکہ آپ کی اس سعی کے مشکور ہونے کا قطعاً کوئی

امکان نہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ غصہ پی لیں یا قومی روایات کے احترام میں اسے تھوک دیں اور بڑے تحمل سے میری تلخ گوئی برداشت کرتے چلے جائیں۔

لحاف کی بدصورتی کی بات چھڑ گئی ہے تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے آپ کے حسنِ ذوق یا حسنِ عمل پر بھی شبہ ہے بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ یہ آپ کے حسنِ ذوق اور حسنِ عمل ہی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے کہ لحاف پر کبھی بیل بوٹے اور پھل پھول بھی نظر آجاتے ہیں۔ پھر اس کی سطح پر بپھرے ہوئے سمندر یا لق و دق صحرا کے نقوش کو اُجاگر کرنے کی کوشش بھی صاف دکھائی دیتی ہے جو اس بات پر دال ہے کہ آپ اس "جنس" کو خوبصورت بنانے کے عزم میں سرشار ہیں۔ لحاف کو حسن عطا کرنے کے بعد اس حسن کو محفوظ رکھنے کی سعی بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ مثلاً کچھ عرصے کی بات ہے مجھے اپنے ایک سکھ دوست کے ہاں رات بسر کرنے کا موقع ملا تھا اور میں نے وہاں لحاف کے حسن کو امتدادِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار سے محفوظ رکھنے کا ایک ایسا منظر دیکھا تھا جو آج تک میری لوحِ دل پر کندہ ہے۔ یہ لحاف کسی اعلیٰ قسم کی مخمل کا تھا لیکن سردار بھائی نے اس مخمل کی حفاظت کے لئے اس پر ایک نہایت غلیظ، کھردرے اور بدبودار کورے کھدّر کا غلاف چڑھا رکھا تھا۔ شکر ہے کہ بات یہیں ختم ہو گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ کھدّر کے اس غلاف کی حفاظت کا اہتمام بھی کرتے تو غلاف در غلاف کا سلسلہ اتنا طول کھینچتا کہ اصل لحاف کسی شعر کے معنی کی طرح لفظوں اور غلافوں کے انبار ہی میں دب کر رہ جاتا۔

خیر یہ تو لحاف کے ظاہری حُسن یا اس کی افادیت کا مسئلہ تھا۔ اور یہ محض ایک اتفاق ہے کہ اس معاملے میں مجھے لحاف کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے انکار ہے تاہم مجھے اس بات سے قطعاً انکار نہیں کہ لحاف ہمارا ثقافتی ورثہ ہے اور اگرچہ اُردو کے بعض افسانہ نگاروں نے اس کے ساتھ کچھ ایسی ویسی باتیں بھی منسوب کی ہیں، مگر اس سے لحاف کا وہ روشن پہلو کسی طور پر بھی ماند نہیں پڑتا جس کا ذکر میں اب کرنے لگا ہوں۔

مجھے اپنی زندگی میں جو چند ادنیٰ مسرتیں حاصل ہوئی ہیں، ان میں لحاف کی معیت

ہیں گزارے ہوئے لمحے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زندگی، بقول شاعر ایک ایسی پیرزنِ حسن فروش ہے جو آلائشوں اور حادثوں سے لیس ہو کر نکلتی اور دل والوں کا پیچھا کرتی ہے اور دل والے ہیں کہ اس سے بھاگ کر کبھی تو رقص گاہ کے راگ رنگ میں کھو جاتے ہیں (اگرچہ اس انہماک کے باوصف، ان کے دلوں میں یہ خطرہ پھڑکتا ہی رہتا ہے کہ کہیں زندگی رقص گاہ کے چور دروازے سے اندر نہ آجائے) کبھی وہ لفظوں، لکیروں اور مجسّموں کی سُندر دنیا میں اپنے نقوشِ پا کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی زندگی سے فرار حاصل کر کے کسی گھنے گھرے جنگل کے آشرم میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن دل والے آخر دل والے ہیں! وہ جو طریق بھی اختیار کریں جائز اور مستحسن ہے۔ دوسری طرف میں ایک دنیادار آدمی ہوں اور پھر میرے پاس وقت بھی کم ہے۔ اس لئے جب زندگی میرا پیچھا کرتی ہے اور مجھے فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تو میں بھاگتا ہوں اور بھاگ کر سیدھا اپنے لحاف میں گھس جاتا ہوں۔

لحاف میرے لئے ایک آشرم ہے ـــــ ایک ایسی جائے پناہ جہاں "پیرزنِ حسن فروش" کی ٹھنڈی سانس پہنچ ہی نہیں سکتی۔ لحاف کی موٹی موٹی دیواریں مجھے پناہ دینے کے بعد "زندگی" کے راستے میں سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور اسے اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ کسی چور دروازے سے داخل ہو کر لحاف کے اندر کی پُرسکون، تاریک اور خاموش دنیا میں ہل چل پیدا کر سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لحاف کو ریسنڈیر اور کمبل ـــــ دونوں پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ لہو گرم رکھنے کا اہتمام کرتی ہیں۔ آشرم مہیّا نہیں کرتیں۔ لیکن لحاف کی خوبی یہ ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی آپ کو محسوس ہوتا ہے گویا آپ اپنی گم شدہ جنّت میں واپس آ گئے ہیں۔ مجھے ہمیشہ لحاف میں داخل ہوتے ہی بے پناہ مسرّت کا احساس ہوا ہے ـــــ ایک ایسا احساس جس میں "میں اب محفوظ ہوں" کا احساس بھی شامل تھا۔ گویا لحاف ایک قلعہ ہے جس میں داخل ہو کر اور جس کے دروازے بند کر کے میں غنیم سے محفوظ ہو جاتا اور اپنی کھوئی ہوئی مسرّتوں اور صلاحیتوں کو دوبارہ حاصل کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب

جب گھنٹوں کی خاموشی، تاریکی اور سکون کے بعد تازہ دم ہو جاتا ہوں تو زندگی سے متصادم ہونے کے لئے لحاف سے باہر نکل آتا ہوں۔ شاید لحاف میں داخل ہوتے ہی مسرّت کا ایک بے پایاں احساس ان ایّام کی یاد بھی ہے جب میرے آباؤ اجداد جنگلوں میں رہتے تھے اور بارش، طوفان اور عناصر کی یورشوں سے بھاگ کر غاروں میں پناہ لیتے تھے۔ اور تب انھیں "مَیں اب محفوظ ہوں" کا وہ احساس ہوتا تھا جو آج لحاف میں گھس کر مجھے حاصل ہوتا ہے۔ یوں بھی لحاف اور غار میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ وہی خاموشی، سکون اور تاریکی جو غار میں ہے لحاف میں بھی موجود ہے اور سچّی بات تو یہ ہے کہ انسانی تہذیب کا ارتقا بھی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ انسان غار سے نکل کر لحاف میں داخل ہو گیا ہے۔

لحاف سے مجھے رغبت شاید اس لئے بھی ہے کہ میں دبے پاؤں اپنی ذات کے کُنجِ خلوت میں داخل ہونے کا متمنّی ہوں اور لحاف مجھے باہر کی دنیا سے اپنا دامن چھڑانے میں مدد دیتا ہے۔ یا شاید صحیح بات یہ ہے کہ لحاف کا حجرہ دراصل میری ذات کا حجرہ ہے۔ چنانچہ جب میں لحاف میں داخل ہوتا ہوں تو ایک پُراسرار طریق سے اپنی ذات کی اس تاریک، اتھاہ اور بے کنار دنیا میں داخل ہو جاتا ہوں جہاں سوچ کی روپہلی کرن پھوٹتی ہے اور جہاں میرے آباؤ اجداد کی ہڈیاں اور انکے خزائن، زمانے کی دستبرد سے محفوظ، ہزاروں سال سے میری آمد کے منتظر ہیں۔!

اجنبی دیار میں

جب میں اپنے دوست احباب سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے سُر سنگیت سے نفرت ہے، اُبھرتے ہوئے نغمے سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور پکّے راگ سے میری قوّتِ ہاضمہ مفلوج ہو جاتی ہے تو وہ میری بات کو محض مزاح پیدا کرنے کی ایک سعی ناکام قرار دے کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاؤں؟ وہ خود ذرا سوچیں کیا اس کرۂ ارض پر جسے ہم "زمین" کہتے ہیں پہلے کچھ کم محشر بپا ہے کہ ہم اپنے گلوں کی پوری قوّت سے اس میں مزید اضافے کرتے چلے جائیں؟ ——— کبھی کبھار کی نغمہ سرائی کو میں بُرا نہیں سمجھتا اور پھر جمہوریت اور مساوات کے اس دور میں ہر شخص کو اپنی الاپنے کا پُورا حق حاصل ہے۔ لیکن ساتھ والوں کے کچھ حقوق بھی تو ہیں جن کا احترام ضروری ہے۔ میرے ہمسائے میں تانگہ چلانے والے پٹھانوں کا ایک پورا خاندان رہتا ہے۔ جب رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس خاندان کے سارے افراد ایک ڈھولک لے کر آنگن میں جمع ہو جاتے ہیں اور آدھی رات تک پشتو نغمے الاپتے ہیں۔ اس الاپ میں ان کے وفادار گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور کتّوں کی "بھونکار" بھی شامل ہوتی ہے۔ صبح سویرے ان کا سرغنہ مجھ سے داد وصول کرنے آجاتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ آخر خون کا رشتہ باقی تمام رشتوں سے برتر و اعلیٰ ہے۔ جب وہ مجھے اپنا پٹھان بھائی سمجھتے ہیں

تو میں کیوں ان سے غدّاری کروں؟ بادلِ نخواستہ دل کھول کر داد دیتا ہوں۔ اگلی رات شور کچھ اور بلند، نغمے کا سُر کچھ اور عالم گیر ہو جاتا ہے اور بچّوں، عورتوں، مردوں، گھوڑوں اور کتّوں کا یہ مشترکہ نغمہ میری ساری کائنات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس "لازوال" نغمے سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ گھر کے جس کونے میں بھی پہنچوں، یہ نغمہ میرا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے۔ فرار کی اب صرف ایک صورت باقی ہے یعنی میں خود بھی اس نغمے میں شریک ہو جاؤں اور لوہے کو لوہے سے کاٹنے لگوں۔ چنانچہ میں اپنی کئی ایک پشتوں کے نسلی تفوّق اور تہذیبی سرمایے کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ان رشتے کے بھائیوں سے ایک رُوحانی تعلق پیدا کر لیتا ہوں۔ اور اپنی آواز کو ان کے شور سے اس طور ہم آہنگ کر لیتا ہوں کہ میرے لئے ان کے نغمے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ میرے اس طریقِ کار کے باعث بیوی نے جس "خوش گوار" سے ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا ذکر میں پھر کبھی کروں گا البتہ اس گانے کے باعث میرے اپنے چہرے کے نقوش میں جو مستقل تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں، خاصی دلچسپ اور خیال انگیز ہیں۔ جس کسی نے کہا تھا کہ نغمہ ایک روحانی شے ہے جو مادی صورت میں ڈھل نہیں سکتا، وہ میرے چہرے کو آ کر دیکھے جس پر یہ نغمہ گویا ابدی طور چپک کر رہ گیا ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہو کہ "نغمے" نے آپ پر رات کی نیند اور دن کا سکھ حرام کر رکھا ہو (دن بھر میرے یہاں ریڈیو کھلا رہتا ہے) اور اس سے پیدا شدہ ہاضمے کی مستقل خرابی نے آپ کو اختلاجِ قلب میں مبتلا کر دیا ہو ——— ایسے میں اگر آپ کا کوئی دوست یہ مژدۂ جانفزا لائے کہ آپ کے ذوق کی پذیرائی کے لئے اس نے ایک محفلِ موسیقی کا خاص اہتمام کیا ہے تو آپ ہی بتائیے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ——— کل صبح پٹھانوں کا سرغنہ داد وصول کر کے رخصت ہوا ہی تھا کہ میرے نہایت عزیز دوست ——— رَ، سَ تشریف لے آئے۔ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ آواز نہایت پُرسوز ہے جو مشاعروں میں ان کے بڑے کام آتی ہے۔ پھر ان کی ایک نہایت اچھی عادت یہ ہے کہ مجھ پر رحم فرماتے ہیں، غزل گا کر نہیں سناتے۔ یہ محض ان کی خاندانی شرافت

تھی کہ موسیقار نے آہستہ سے کوئی نغمہ چھیڑا۔ میں چونک پڑا۔ شور اور ہنگامے اور انتشار اور تصادم میں یہ کیسی لطیف سی کیفیت تھی جس نے ایک رنگین مچھلی کی طرح تالاب کی نیلی سطح سے جست بھری تھی۔ اور ذہن کی تاریکی میں اُجالے کی ایک لکیر سی کھینچ کر دوبارہ تالاب میں غوطہ لگا گئی تھی۔ یکایک، جیسے نیند سے میری آنکھیں کبھی آشنا ہی نہیں تھیں، میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شاید غنودگی نے ایک سرابی کیفیت کو جنم دے دیا تھا۔ ورنہ نغمے میں یہ کیفیت ؟ ——— لیکن اب تو رنگین مچھلیاں گویا حرکت میں آگئی تھیں اور میں ان کے اُبھرنے اور ڈوبنے کے ساتھ خود بھی ڈوبنے اور اُبھرنے کے عمل میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میرے سارے احساسات کا تعلق موسیقار کی انگلیوں اور اس کے ہونٹوں کی موہوم سی جنبش کے ساتھ ہے اور وہ جیسے چاہتا ہے میرے احساسات کے ساتھ کھیلتا چلا جاتا ہے۔ کیا نغمے کی یہی وہ لازوال کیفیت تھی جس کے بارے میں اہلِ فن نے کتابیں لکھی ہیں ؟ ——— ابھی میں کچھ فیصلہ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ موسیقار کے لبوں سے ایک بول نکلا اور سنہری مچھلی کی طرح لپک کر غائب ہو جانے کی بجائے ایک مجسّم کیفیت، ایک ہزار رنگ تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے پھیلنے لگا۔ اس بول میں کوئی لفظ، کوئی اشارہ، کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ ہر طرح کے سہارے، لبادے اور نقاب سے بے نیاز، یہ جذبے کی برہنہ صورت تھی جو میرے سامنے مجسّم ہو کر آگئی تھی۔ میں خود شعر کہتا ہوں اور لفظوں، علامتوں اور اشاروں کنایوں سے دل کی بات کو پیش کرتا ہوں۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جذبے کو اس کی بالکل ننگی صورت میں دیکھا تھا ——— اب بول کا سُر کروٹ لے کر پھیل گیا تھا اور مسلسل پھیلتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ہر مدّ و جزر میں درد اور کسک اور فراق اور ملن کی ہزار کیفیتیں ایک دوسری میں ڈوبتی، ایک دوسری سے ملتی اور پھر جدا ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اور میں خود اس ڈولتے اور تھرکتے ہوئے سمندر میں ایک بے بس تنکے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کیفیت کب تک قائم رہی البتہ ایک طویل عرصہ کے بعد جب مجھے اپنے بازو پر ایک مضبوط سی گرفت

ہے ورنہ اگر وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئیں تو میں ان کا کیا بگاڑ سکتا ہوں! بہرحال رئیس تشریف لائے اور خلافِ معمول یہ "مژدہ جاں فزا" بھی لائے کہ اُن کے ایک مشہور موسیقار دوست تشریف لائے ہوئے ہیں اور رات کو ان سے پکّا راگ سننے کے لئے ایک محفلِ موسیقی برپا ہوگی۔ میں نے فوراً قاعدے کے مطابق اپنے چہرے پر مسرّت کی کیفیت پیدا کر لی، لیکن جی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس محفل میں میری شرکت کے لئے اصرار نہ کرنے لگیں۔ اور پھر وہی ہوا جو منظورِ خدا تھا۔ اور جسے کارکنانِ قضا و قدر نے میری لوحِ تقدیر پر لکھ رکھا تھا، یعنی انھوں نے کہا کہ وہ اپنے موسیقار دوست کے سامنے موسیقی سے میرے گہرے شغف کا ذکر کر چکے ہیں، اس لئے میری شرکت نہایت ضروری ہے میں نے ہزار کوشش کی کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آجائیں۔ لیکن کہاں؟ —— سر درد کا بہانہ کیا، اپنی بیوی کی علالت کا ذکر چھیڑا، اپنی بدذوقی کے ثبوت میں یہ نکتہ پیش کیا کہ پکّے گانے سے مجھ پر نشہ طاری ہو جاتا ہے اور میں خرّاٹے لینے لگتا ہوں، آپ کے موسیقار دوست کی دل شکنی ہوگی۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے چُپ بیٹھے میری باتیں سنتے رہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایک مسلسل خاموشی ارادے کی پختگی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جب میں بولتے بولتے تھک گیا۔ اور وہاں "ایک ہی خامشی مرے سب کے جواب میں" مسلّط رہی تو میں نے آخر ہار مان لی اور نحیف سی آواز میں کہا: "اچھا چلوں گا"۔ اس پر وہ مسکرائے، اٹھے اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

محفلِ موسیقی کے لئے آٹھ بجے رات کا وقت مقرّر کیا گیا تھا۔ لیکن سازوں کے ساتھ موسیقار کا موڈ بھی کہیں دس بجے کے قریب جا کر درست ہوا۔ اور وہ نہایت بے نیازی سے جھومتے جھامتے تشریف لے آئے۔ اس وقت تک میرا بُرا حال ہو چکا تھا نیند سے پپوٹے بوجھل تھے اور آنکھوں کے سامنے ساری محفل گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں سازندوں نے اپنے اپنے سازوں کو چھیڑا۔ ہارمونیم کراہنے لگا سارنگی نے ایک دلدوز چیخ ماری اور طبلہ اپنا سر پیٹنے لگا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہا تھا جس کا ہر عمل جنّاتی اور جس کی ہر کروٹ ناقابلِ برداشت

کا احساس ہوا تو میں آسمانی رفعتوں سے واپس اس عالمِ خاک پر آگرا۔ اس وقت میرے دوست نغمے کے بارے میں میری رائے دریافت کر رہے تھے۔ میری رائے کیا ہو سکتی تھی؟ —— میں کہ اپنے احساسات کے اظہار کے لئے لفظوں کا محتاج ہوں، میں انھیں کیا بتاتا کہ آج سے قبل میری زندگی بالکل ادھوری اور نامکمل تھی اور میں محض سمندر کی سطح پر ہاتھ پاؤں مار تا رہا تھا۔ لیکن آج میں نے پہلی بار غوطہ لگا کر سمندر کی پہنائیوں تک رسائی حاصل کر لی تھی اور زندگی کو اس کے اصل رُوپ میں دیکھ لیا تھا۔ اس رُوپ میں جس نے اپنے پَرتو سے میرے دل کو روشن اور میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر انور سدید

"ڈاکٹر وزیر آغا شاید اُردو کے واحد ادیب ہیں جن کا نام اردو ادب کی ایک صنف اظہار کے ساتھ کچھ اس پختگی سے وابستہ ہو گیا ہے کہ اب اس صنف کا تصور وزیر آغا کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں رہا۔ یہ صنفِ اظہار انشائیہ ہے اور اسے وسیع پیمانے پر متعارف کرانے، اس کا دائرہ تخلیق بڑھانے، تخصیصی نقوش اُجاگر کرنے اور اسی کی فنی بوطیقا کی ترتیب میں وزیر آغا نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اس صنف کی نمائندہ تخلیقات پیش کیں بلکہ اُردو انشائیہ کے اوّلین نقاد کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ چنانچہ اب تک انشائیہ کے باب میں جتنے مباحث اُٹھے ہیں، ان سب کے پسِ پُشت وزیر آغا کے نظریات کے اثبات یا ان سے اختلاف کا زاویہ موجُود نظر آتا ہے اور اب تک اس موضوع پر جو سیر حاصل بحث ہوئی ہے اس کا محیط انہیں کے اِٹھائے ہوئے مرکزی نقطے کے گرد قوس بنا رہا ہے۔

انشائیہ نگار کی حیثیت میں وزیر آغا نے جذبے کو اپنی شخصیت کا لمسِ فراواں عطا کیا اور خیال کی نازک موجوں کو ہر چہار جانب بے پروا حرکت کرنے کی اجازت دی۔ وزیر آغا کا انشائیہ شعور اور لاشعور کے سنگم پر تخلیق ہوتا ہے اور اس میں حقیقت کے جو متعدد زاویے اُبھرتے ہیں وہ روح سے مس کر کے ہی خارج کی دنیا کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔

وزیر آغا کے انشائی اسلوب میں فکری موشگافی اور نکتہ آفرینی کا کثیر عنصر شامل ہے، یہ اسلوب ایک نکتے کو دوسرے نکتے سے ملاتا ہے اور اس سے معنویت کی ایک نئی تیسری صورت پیدا کر دیتا ہے، وزیر آغا نے انشائیہ میں مظاہر کے مخفی معانی اُجاگر کئے ہیں، اس عملِ انکشاف میں ان کے اسلوب نے ان کی سب سے زیادہ معاونت کی ہے، چنانچہ ان کے انشائیے میں تازہ کاری بھی ہے اور ندرت بھی، یہ انکشافِ ذات بھی ہے اور عرفانِ ذات بھی، اس میں سنجیدہ فکری بھی ہے اور شگفتہ نگاری بھی۔ انشائیہ کے آفاق پر جو روشنی سب سے نمایاں ہے اس کا ماخذ و مصدر وزیر آغا کا انشائیہ ہی ہے۔"

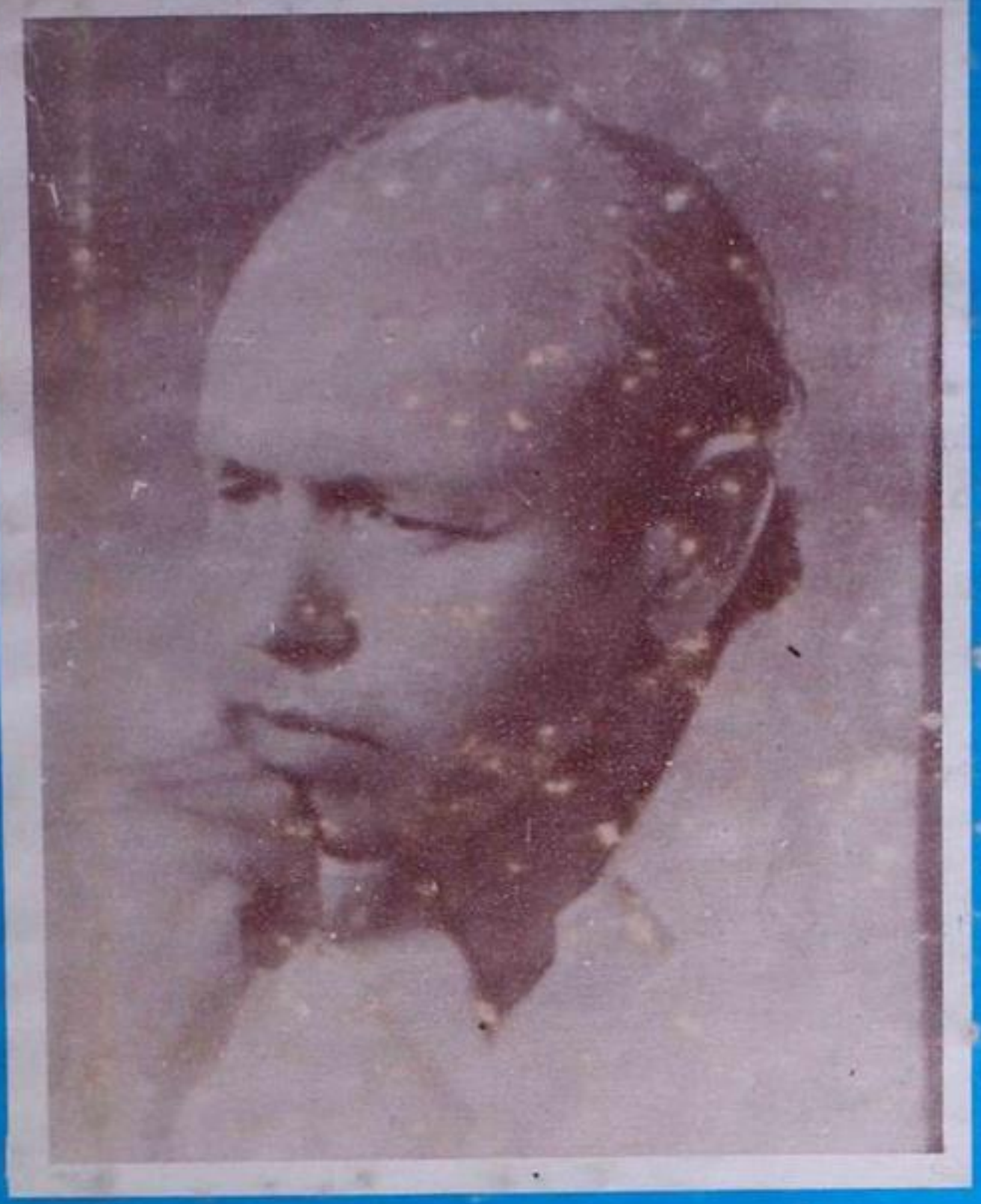

مُصنّف

مشتاق احمد یوسفی

"وزیر آغا کا انشائیہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا عکسِ جمیل ہے۔ ان کی طبیعت میں جو دلآویزی، رچاؤ اور شائستگی ہے، زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح چاہا اور نبا ہا ہے وہ ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔"